# فریب عرف ویمپائر

ایک نہایت ہی دلچسپ اور عجیب و غریب داستان

یعنی

ایک پاکباز اور عصمت مآب لڑکی کی آبروریزی کی دلخراش اور دردناک کہانی خود اُسکی زبانی

مُصنّفہ

مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے۔ ایل ایل بی چیف جج جاورہ اسٹیٹ

جہانگیر بک ڈپو کھاری باؤلی

دہلی

قیمت تین روپے

بار دوم

(مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی)

# فہرست مضامین

| صفحہ | عنوان | نمبر شمار |
|---|---|---|
| | **دوسرا حصّہ** | |
| | تمہید مصیبت . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . | (۸) |
| | حسن عصمت . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . | (۹) |
| | افشائے راز . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . | (۱۰) |
| | مصیبت . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . | (۱۱) |
| | انتہائے مصیبت . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . | (۱۲) |
| | **تیسرا حصّہ** | |
| | ویمپائر . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . | (۱۳) |
| | الٹی تعبیر . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . | (۱۴) |
| | "درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا" . . . . . . . . . . . | (۱۵) |

# معذرت

گھاس چھیلتے چھیلتے جی میں آیا کہ لاؤ "اُردو زبان" کی کمر پر ایک لٹھ دیں چنانچہ جب یہ طے کرلیا تو؟ ........ پھر کیا تھا ........ لُغت پھاڑ ڈالی! قواعد پھینک دی! محاورے توڑ ڈالے! الفاظ دے مارے! جُملوں کی ٹانگیں چیر ڈالیں! ٹریجڈی کا سر پھاڑ دیا اور ظرافت نگاری کو چاروں خانے چت پچھاڑ دیا اور پھر خم ٹھونک کر کہا ؎

"دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا"

اب آپ کا کام یہ ہے کہ کوک شاستریں پھاڑ ڈالئے۔ وہ تمام کتابیں جو وعی اور خانگی زندگی اور "سیکشوئل سائنس" کے بہانہ سے لکھی گئی ہیں اور جن کا ب ولہجہ بہت ہی "اچھا" ہے انھیں جلا ڈالئے! کیونکہ میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ ن کا مصنف ناکام رہا اور اُردو کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ محض اس لئے کہ "سیکشول سائنز" پر کتابوں کی جو اُردو زبان کو ضرورت تھی وہ جوں کی توں رہ گئیں اور اُردو

اللہ کے فضل سے فواحشات سے مالامال ہوگئی۔

پھر ان نیم عریاں نہیں بلکہ سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی رنگ برنگی رسالوں کی تصویروں کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی جن کو سخت بدبودار اور غلیظ سُرخیاں دے کر مادرزاد برہنہ اور ننگا کر کے ادبی رسائل میں پیش کیا جاتا ہے محض یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچانے کے لئے کہ بکتے ہیں اور جھک مارتے ہیں تمام وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ :۔

"کہ ایک مادرزاد برہنہ خوبصورت عورت کی تصویر کسی ادبی رسالہ میں شائع کرنا اتنا نقصان دہ اور فحش نہیں ہے جتنا کہ نسبتاً ایک بدصورت عورت کی تصویر پیش کرنا، جو بہت سے کپڑے پہنے ہو اور اس کو ایک نہایت ہی خبیث۔ نہایت ہی ناپاک۔ نہایت ہی گندی۔ نہایت گھناونی۔ نہایت ہی غلیظ اور حیا سوز سُرخی دے کر مادرزاد برہنہ تصویر سے بھی کہیں زیادہ فحش بنا کر شائع کرنا۔ کیونکہ قانون اور مذہب اور طب اور آرٹ میں عُریانیاں بھری پڑی ہیں مگر وہاں فواحشات کا نام نہیں، وجہ یہ ہے کہ واقعات اور عبارت کی عُریانی کوئی چیز نہیں۔ تاوقتیکہ عبارت کو اور واقعات کو گندے اور فحش اور عفونت آمیز لب و

لہجہ سے زہریلا نہ بنا دیا جائے!!

اور پھر حضرت میری معذرت پر غور کیجئے۔ آخر میں نے کون سی خطا کی ہے جو آپ مجھ کو میرے پیدائشی حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ میں افسانہ نویس ہوں اور اردو کے ہر افسانہ نویس اور ادیب کا پیدائشی حق ہے کہ ادبیات اور فواحشات میں ایک قدم کا بھی فاصلہ نہ رہنے دے۔ اسکول کے دس دس اور پندرہ پندرہ برس کے بچوں کو نوجوانان کالج و اسکول کی اصلاح کا نام لے کر اُن کا مخش طریقہ سے مذاق اڑائے۔ اور پھر اپنے اردو کے افسانوں میں ایک فرضی! مصنوعی! سرتاپا غلط ناممکن الوقوع غیر فطری اور حیا سوز کورٹ شپ کے حالات یعنی ہیرو اور ہیروئن کی نام نہاد عشقیہ گفتگو یا مکالمہ کو ایک نہایت ہی گندے لہجے میں بیان کر کے ان تمام فواحشات کو ادبیات کے زمرہ میں داخل کر کے افسانہ نویس بن بیٹھے، لہٰذا جناب یہ میرا پیدائشی حق ہے۔

"ویمپائر" ایک انگریزی لفظ ہے اور مجھے تسلیم ہے میں نے انگریزی زبان کی چوری کی۔ مگر حضرت یہ بھی میرا پیدائشی حق ہے۔ دیکھتے نہیں آپ کہ اُردو زبان کے ادیب ایران اور عرب اور خراسان اور ٹرکی پر حملہ کر رہے ہیں اور عرب کو تو لوٹ لیا میں چونکہ مسلمان ہوں لہٰذا میں نے سوچا کہ مسلمانوں کو تو چھوڑو۔ یہ انگریز بڑی چلتی رقم

ہیں، اِن کے یہاں ڈاکہ ڈالو۔ چنانچہ میں یہ لفظ انگلستان پر ڈاکہ ڈال کر اُردو کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کیونکہ اُردو کو اِس لفظ کی سخت ضرورت تھی۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو بسم اللہ کر کے انگریزی کی لُغت یعنی ڈکشنری اُٹھا کر دیکھ لیجئے کہ میں سچ کہتا ہوں یا جھوٹ اور پھر یہ بھی نوٹ کر لیجئے گا کہ یہ "میڈ اِن انگلینڈ" ہے اور یہ مال ایران اور توران اور عرب اور مغرب کہیں نہیں ملے گا۔

جودھپور
۲۴۔ نومبر ۱۹۳۲ء

عظیم بیگ چغتائی

# پہلا حصہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؏

# موت کی نیند

اے راجا پرجا کے مالک !...... اے کارساز حقیقی .... مجھکو واقعی یہ ہرگز نہیں معلوم تھا کہ ایک نہایت ہی خوف ناک ظلم بھی ہے جو کسی معصوم لڑکی پر توڑا جا سکتا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہوں گی ......... اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ..... کہ باوجود اپنی انتہائی خباثت اور شیطنت کے مظلومہ کی تجربات و تاثرات مابعد ظلم۔ اگر ایک فلسفی کے لئے قدرت کاملہ کی الجھی ہوئی گتھی نہیں تو ساتھ ہی ایک ماہر نفسیات کے لئے شاید دلچسپ ترین مسئلہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مظلوم لڑکی کے بعد میں کیا جذبات ہوتے ہیں؟ وہ کس مہیب اور ہیبتناک پریشانی میں پڑ جاتی ہے؟ کس طرح اس کی روح ایک غم اور درد کی جاں گسل

جہنم میں ڈال دی جاتی ہے؟ یہ تمام اور دوسری باتیں نفسیات کے پروفیسر کے لئے بہترین مواد ہیں۔

لہٰذا آئیے اور میری داستانِ درد سُنئے۔ دیکھئے کہ ظلم ایک ایسا بھی ہوتا ہے۔

ہمارے خاندان میں دو تقریبیں درپیش تھیں۔ ایک تو خود میرے نکاح کی تقریب اور دوسری میری ماموں زاد بہن کی رخصتی یا شادی۔ پہلے میرے نکاح کی رسم ادا ہوئی اور یہ طے پایا کہ رخصتی بعد میں کی جائے گی۔ جب میرے شوہر پولیس ٹریننگ اسکول سے پاس ہوکر ملازمت پر جائیں گے۔

میرے نکاح کی تقریب کے سلسلہ میں خوب خوب مہمانداریاں ہوئیں، اور اُس کے بعد ہم سب قافلہ کا قافلہ بن کر ماموں صاحب کے یہاں روانہ ہوئے۔ ممانی صاحبہ مع اپنی بیٹی کے بیشتر ہی چلی گئیں تھی۔

سفر کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ ڈیڑھ درجن بیویاں مع اتنے ہی بچوں کچوں کے سامانِ سفر تیار کرنے لگیں۔ ہم لوگ بارہ بجے والی گاڑی سے روانہ ہوئے۔ برات کا معاملہ سب کے پاس تیسرے درجے کے ٹکٹ تھے۔ اور بھیڑ بھاڑ کی وجہ اور

جگہ کی قلت سے سب عورتیں جلدی میں ایک جگہ نہ بیٹھ سکیں۔ گاڑی میں دو زنانہ درجے تھے۔ اس لئے کچھ ایک میں بیٹھ گئیں اور بقیہ دوسرے زنانے درجے میں بٹھا دی گئیں۔

خدا کی شان کہئے کہ تین اسٹیشن چل کر ایک بارات اور آئی، اور کوئی دو درجن عورتیں ان دونوں زنانہ درجوں میں ٹھونس دی گئیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جگہ کے معاملہ میں نفسی نفسی کا یہ عالم ہوا کہ جو جہاں بیٹھا تھا وہیں کا وہیں جم کر رہ گیا۔ تاکہ کہیں کوئی جگہ نہ چھین لے۔ میں گاڑی کے انتہائی سرے پر ایک جگہ پر قبضہ کئے مزے سے کونے میں تکیہ لگائے اس طرح بیٹھی تھی کہ جب چاہوں آرام بھی کر سکوں۔ دوسری ساتھ والیاں ذرا آگے بڑھ کر، گاڑی کے دوسرے حصہ میں سکڑی سکڑائی بیٹھی تھیں۔ میں ہی سب سے زیادہ آرام سے تھی۔ والدہ صاحبہ دوسرے درجے میں تھیں اور اس درجہ میں اور بھی زیادہ غیر دلچسپ رشتہ دار تھے جن کے ساتھ کی وجہ سے سفر اور بھی تکلیف دہ ہو رہا تھا۔

ہماری گاڑی رات کے گیارہ بجے کے قریب منزلِ مقصود پر پہونچتی تھی اور یہ

بات مجھے پیشتر سے معلوم تھی۔ جیسا کہ بتا چکی بیحد غیر دلچسپ سفر تھا۔ نہ تو کوئی ہم عمر اور نہ کوئی سہیلی، کہ جس کی موجودگی کی وجہ سے سفر کی دلچسپیاں زبردستی ہی محسوس کی جاسکتیں۔

دن بھر کی تکان اور ماندگی۔ پھر جگہ کی قلت۔ اور علاوہ ازیں سفر کی غیر دلچسپی یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ میں تھکن اور کوفت کی وجہ سے چور ہو کر رہ گئی۔ ہجوم اور بچوں کا شور وغل، اور تیسرے درجے کی عورتوں کی بدتمیزیاں۔ یہ تمام باتیں ایسی تھیں جنہوں نے درجے کو جہنم بنا دیا تھا اور مزید براں گنوار عورتوں کی دھکا پیل سے اور بھی تکلیف ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے دوسری ساتھ والیاں ایک اسٹیشن پر اتر گئیں اور درجے میں ایسا معلوم ہوا کہ گویا سانس لینے کو جگہ نکل آئی۔ کچھ مجھے بھی پھیل کر بیٹھنے کا موقعہ ملا۔

مگر یہ سہولیت عارضی ثابت ہوئی اور دوسرے ہی اسٹیشن پر بہت سی گنواریاں گھس آئیں۔ میرے آس پاس گنواریاں اور چماریاں اس قدر گھس آئیں کہ اور بھی جی گھبرانے لگا۔ چچی نے کہا بھی مجھ سے کہ ادھر آجا۔ مگر میں باوجود گنواروں میں محصور ہونے کے اپنی جگہ پر ضرورت سے زیادہ آرام سے بیٹھی تھی۔ لہٰذا وہیں جمی بیٹھی

رہی۔

کھانے کا وقت آیا تو میں نے طبیعت میں ایسی گرانی محسوس کی کہ انکار کر دیا مگر چچی نے زبردستی کھانے پر مجبور کیا۔ کہاں تو بھوک ہی نہ تھی اور کہاں کھانے جو بیٹھی تو پَر اٹھے اور دوسرے تکلفات جو سامنے آئے تو خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانا کھا کر میں پھر اپنی جگہ پر جلدی سے پہونچ گئی کہ کہیں کوئی قبضہ نہ کر لے۔

دس بجے رات تک کا تو مجھے خیال ہے اندازاً، کہ میں جاگ رہی تھی، اور ہوشیار تھی۔ مگر اُس کے بعد ذرا پیر پھیلانے کی جگہ جو ملی، تو ایسی غافل سوئی کہ خدا کی پناہ! تقدیر کا بدا پورا ہونا تھا۔ اسی بہانہ سے سہی!

قدرت کے کھیل بھی زیادہ تر اتفاقات کا بہانہ ڈھونڈھتے ہیں۔ اور اکثر اتفاق نہیں بلکہ اتفاق پہ اتفاق!

میں بے خبر ہو کر سو گئی، یہ اتفاق تھا۔ دوسرا اتفاق یہ کہ جس طرف میں بیٹھی تھی اُس طرف اسٹیشن نہ آیا، یعنی منزل مقصود۔ تیسرے یہ اتفاق کہ اترنے والیاں اتر گئیں اور میں گویا سامانِ سفر تھی کہ دھری کی دھری رہ گئی۔ اور پھر ان اتفاقات پر سب سے بڑا اتفاق یہ کہ ایسی موت کی نیند سوئی کہ آنکھ

جاکر جاگنا بھی ختم ہو گیا ؛

# اندر بلا

مجھے نہیں معلوم کہ رات کے کے بجے تھے۔ مگر غالباً ساڑھے بارہ یا ایک کا عمل ہو گا۔ ہوا میں قدرے خنکی تھی اور میں ایک چادر اوڑھے پڑی غافل سو رہی تھی۔ کہ ایک نہایت ہی کرخت اور دل خراش آواز سے میں چونک پڑی۔ کسی نے نہایت ہی درشتی کے ساتھ دیہاتی آواز میں کہا "یہ کون ہے؟"

چاروں طرف مہیب اور منحوس تاریکی چھائی ہوئی تھی، اس تاریکی میں آواز "یہ کون ہے؟" اپنی انتہائی درشتی اور سختی کے ساتھ میرے دماغ میں بھالا مار کر سیاہی میں ڈوب گئی اور آنکھ کھلتے ہی میرے کانوں نے بدبودار فضا کی تاریکی میں فاصلے پر انجنوں کی سنسناہٹ اور اِکّا دُکّا گاڑیوں کو اِدھر سے اُدھر گھسیٹنے اور

اور چھوڑنے کی گڑگڑاہٹ سنی۔ معاً مجھے آنکھیں کھولتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ تاریکی و نیرگی کا خوفناک عفریت "یہ کون ہے؟" کا بھالا مار کر سیاہی میں غوطہ مار گیا ہے! میری نظر ایک کھڑکی میں گول گول چیز پر پڑی اور قبل اس کے کہ میں کچھ سوچ یا سمجھ سکوں، ایک دیہاتی مگر نہایت ہی سخت آواز نے پھر وہی الفاظ دُہرائے "ارے یہ کون ہے؟"

میں اٹھ بیٹھی تھی اور جلدی سے میں نے سرہانے سے اپنا برقعہ نکالا مگر میں کس طرح اس نامراد سناٹے اور تاریکی کی وجہ سے گھبرا کر اٹھی ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی میرے منہ سے نکلا "یہ کون اسٹیشن ہے؟" اسٹیشن کا نام معلوم کر کے میرے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ مجھے ہوشیار کرنے والا دراصل ریلوے کا ملازم بھنگی تھا۔ اور اس نے اسٹیشن کا نام بتا کر پھر کہا "اترو گاڑی سے۔ گاڑی گودام میں لگی ہوئی ہے، اس میں سونے کا حکم نہیں ہے۔"

---

واقعہ صاف تھا۔ میں سوتی ہوئی بہت آگے چلی آئی تھی۔ یہ بھی مجھکو معلوم تھا کہ یہ گاڑی اس جنکشن پر پہونچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ انجن نے گاڑی کو پلیٹ فارم سے کھینچکر "یارڈ" میں لگا دیا تھا۔ ساری گاڑی خالی تھی اور میں اس گاڑی کی اس

گاڑی کی اس ہولناک تاریکی میں تنہا مُسافر تھی۔

یا میرے اللہ! اب کیا کروں؟ کیسے واپس جاؤنگی؟ میرے پاس تو ایک کوڑی نہیں! یہ خیالات ذہن میں آنے بھی نہ پائے تھے کہ اس بھنگی نے مجھے خاموش دیکھ کر ایک اور لتاڑ دی "جلدی اترو گاڑی میں سے۔ کون ہو تم؟"

میں نے دو حرفوں میں اُسے اپنی مصیبت سُنائی اور وہ بھی اس پریشان لہجے میں کہ مجھے توقع ہوئی کہ یہ میرے ساتھ ہمدردی کرے گا۔ یعنی میں اس بات کی اُس سے متوقع ہوئی جس کے نام سے ریلوے ملازمین کو کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اُس نے میری بات سُن کر نہایت ہی "ریلویانہ" سادگی سے کہا "ہم کچھ نہیں جانتے۔ تم اترو فوراً۔"

میں نے فقیرانہ لہجے میں کہا کہ "تم میرے گھر کسی بابو سے کہہ کر تار دلوا دو تو عمر بھر احسان نہ بھولوں گی۔" وہ بولا "ہم نہیں جانتے تار وار۔ ہم نہیں جائیں گے واپس اسٹیشن۔ تم خود چلی جاؤ......وہ سامنے اسٹیشن ہے وہاں کسی بابو سے کہنا۔"

اتنا کہہ کر وہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ میرے پاس کچھ سامان تو تھا ہی نہیں، چار و ناچار اُتری تو پلیٹ فارم نہ تھا اور پھر اندھیرا مگر جس طرح بن پڑا اتری۔ میرے اُترتے ہی بھنگی نے پھر انگلی اٹھا کر کہا "وہ دیکھو اسٹیشن ہے۔ روشنی چمک رہی ہے۔"

میں نے چاروں طرف کی سیاہی اور تاریکی پر غور کیا۔ بھنگی کے کہنے پر اسٹیشن کی طرف نظر ڈالی۔ ایک دم سے میں ڈر سی گئی۔ ایک زبردست بھوت تھا یا سگنل! جو اپنی واحد سرخ آنکھ سے مجھے گھور رہا تھا۔ کس قدر منحوس معلوم ہو رہا تھا! مرتا کیا نہ کرتا۔ اب سوچی کہ راستہ کدھر ہے۔ کہیں راستہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا میں چار و ناچار اسٹیشن کی روشنیوں ہی کی طرف بڑھی تھی کہ بھنگی کو شاید میری لاچاری پر رحم آ گیا۔ وہ دوسری طرف چلا تھا کہ رک گیا اور پکار کر مجھے راستہ بتایا۔ کہ اِدھر ہو کر جاؤ، مگر ساتھ ہی اتنا کہہ کر وہ لوٹا اور میرے قریب آ کر ازراہِ انسانیت وہمدردی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا اور بولا "دیکھو وہ سامنے مال گودام کے بابو کا کوارٹر ہے۔ وہاں جا کر تم کہنا اور وہ تمھاری ذات برادری کے (یعنی مسلمان) ہیں وہ تمھاری مدد کریں گے"۔

میں یہ سنکر خوش ہو گئی۔ میں نے خوشامد سے کہا "بھیّا تو اتنا کر کہ مجھے وہاں تک ذرا پہونچا دے"۔ اور اس کو آمادہ پاکر میں نے جب پوچھا کہ بابو کے یہاں عورتیں بھی ہیں یا نہیں تو اُس نے جواب دیا کہ "بیوی، بال بچے وغیرہ سب ہیں"۔

میں خوش خوش اب ہمت کے ساتھ چلی۔ وہ میری خوشامد سے متاثر ہو کر آگے

آگے اور میں پیچھے پیچھے۔ تھوڑی ہی دور چل کر میں ایک تار میں اُلجھ کر گری۔ وہ بولا
"دیکھو مائی ...... دیکھ کر ......"
جلدی سے اٹھی۔ مہتر کو اطمینان دلایا کہ چوٹ نہیں لگی اور پھر اُسی طرح چلی۔
یعنی وہ آگے آگے اور میں اس کے پیچھے۔ اپنی بے بسی اور مصیبت اور اتفاق
پر پُر زور لیکچر دیتی ہوئی کہ کہیں یہ اپنا ارادہ ملتوی کر کے واپس نہ چلا جائے۔

---

تار اور ریل کی پٹڑیاں پار کر کے اور تھوڑا سا چکر دے کر مہتر نے مجھے ایک
کوارٹر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ایک میلا سا پردہ دروازے پر لٹکا ہوا کہہ رہا تھا کہ
اس میں عورتیں بھی رہتی ہیں۔ یہ امر کس قدر باعثِ اطمینان تھا!
مہتر نے "بابو صاحب" کے عام لفظ کو بلند آواز سے پکارا۔ دوسری ہی آواز
پر اندر سے جواب آیا۔ میں خوش ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ لوگ ابھی جاگ رہے
ہیں۔ قدموں کی آواز، لالٹین کی وہ روشنی جو دروازے کے سوراخوں اور
درازوں میں سے ہو کر ٹاٹ کے پردے میں سے چھنتی ہوئی معلوم دی! اور پھر
دروازے کی جنبش! اس ظاہرا خوشگوار، مگر حقیقتاً خوف ناک تمہید کے بعد
دروازہ کھُلا۔ ایک نوجوان لالٹین لئے ہوئے نکلا۔ لالٹین اونچی کر کے بغیر پوچھے

پوچھے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔ مہتہ نے بڑے اختصار کے ساتھ میری مصیبت بیان کی اور سفارش کی کہ مجھے آرام سے میرے گھر پہونچانے کا انتظام کرائیں اور تار ابھی دلوا دیں۔

اتنا سنتے ہی بڑے اخلاق سے اُس نوجوان نے پردہ اٹھا کر میرے لئے راستہ چھوڑ دیا اور مجھ سے اندر جانے کو کہا۔ میں اندر آئی اور وہ مہتہ سے باتیں کرنے لگا۔

# خوفناک فیصلہ

میں اندر جو آئی تو ایک دم سے ٹھٹک کر رہ گئی ۔ ایک گھٹا سا مکان تھا کہ پنجرہ ! سامنے تین یا چار دروں کا برآمدہ اور کمرہ ۔ اور اُس کمرے کے دروازے پر ایک اور شخص چوکھٹ پکڑے کھڑا تھا ۔ اندر کمرے کے تیز روشنی تھی ۔ مگر عورتوں کا نام نشان تک نہیں ۔

میں گھبرائی کہ یہاں تو عورتیں نہیں ہیں اور کھڑی کی کھڑی رہ گئی ، سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا اور پشت پر سے دروازہ بند ہونے کی آواز نے گویا زور دے کر کہا کہ اس طرف بھی ایک مرد ہے ! دروازہ بند کر کے وہ شخص اندر آیا میرا دل بیٹھ سا گیا اور بڑی گھبراہٹ معلوم ہوئی ۔ یا میرے اللہ ! یہاں تو سوائے دو نوجوانوں کے اور کوئی بھی نہیں ! برآمدہ میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا ۔ مجھے اس

پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے دونوں کمرے میں چلے گئے اور کچھ باتیں کرنا شروع کیں۔ مگر فوراً ہی دونوں لالٹین لے کر باہر آئے۔ اور نہایت گستاخانہ طریقہ پر میرے سامنے کھڑے ہو کر لالٹین سے میرا جائزہ لینے لگے۔ میں برقعہ پہنے کھڑی تھی اور وہ دونوں مجھے گھور رہے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ میں پریشانی کی وجہ سے بے کل ہو گئی۔

ایک نے دوسرے سے کچھ انگریزی میں کہا جو میں بالکل نہ سمجھی۔ لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی کہ میرے ہاتھوں کے بارے میں کچھ بات تھی۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنے ہاتھ اندر کر لئے اور کچھ دل کو مضبوط کر کے میں نے کہا کہ "مجھے اسٹیشن پر پہونچا دیجئے اور چل کر تار دلوا دیجئے"۔

اس کے جواب میں وہ نوجوان جس نے دروازہ کھولا تھا نہایت ہی خراب لہجہ میں بولا "تم کون ہو؟" میں نے سخت پریشان ہو کر کہا "میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں"۔

دوسرا جو تھا وہ بڑی رسانیت اور انسانیت سے بولا "تم اطمینان رکھو کمرہ میں چلی جاؤ۔ ہم دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ عورتیں بھی آئی جاتی ہیں۔ گھبراؤ مت اسی لئے پوچھتے تھے کہ عورتوں کو بلائیں۔ اگر کہو گی تو ابھی اسٹیشن پہونچا دیں گے اور

نہیں تو عورتوں کو سامنے کے کوارٹر سے بلوائے لیتے ہیں۔ تم اطمینان سے کمرے میں جا کر بیٹھو۔ اور کمرہ اندر سے بند کر لو۔ ہم ابھی ابھی عورتوں کو بلواتے ہیں۔ گھبراؤ مت ہم بھی آخر شریف اور بھلے آدمی ہیں۔"

اتنا کہہ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ اور اُس کے آخری جملہ سے مجھے سخت شرمندگی معلوم دی۔ طعنہ زنی سی معلوم ہوئی۔ میں سیدھی کمرے میں چلی گئی۔ اور انھوں نے خود دروازہ بھیڑ دیا اور پھر کہا "ابھی ابھی عورتیں آتی ہیں۔ ابھی تار دیتے ہیں۔"

میں کمرے میں پہونچی۔ اندر ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ دو پلنگ تھے۔ اِن پر بچھونے بچھے ہوئے تھے۔ سامنے کھونٹی پر کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی، مگر کوئی ایسی چیز نظر نہ پڑی جس سے عورتوں کے وجود کا شبہ ہو سکتا پلنگ پر بیٹھ گئی مگر بیٹھتے ہی میرے بدن میں ایک سنسنی سی محسوس ہوئی اور موت کی سی ٹھنڈک بیٹھ گئی! اب مجھے خیال آیا کہ کمرے میں مجھے نہ آنا چاہئے تھا۔ یہ تو غلطی پر غلطی ہوئی مگر میں چار و ناچار بیٹھ گئی اور قدرتاً میں نے باہر کی طرف کان لگائی کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر وہاں تو وہی سکوتِ نیم شبی تھا۔ جس میں رہ رہ کر انجنوں کی

سنسناہٹ یا گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ کے علاوہ کوئی اور دوسری آواز نہ تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ باہر اب شاید کوئی نہیں۔ مگر فوراً ہی مجھے شبہ ہوا کہ باہر سرگوشیاں سی ہو رہی ہیں۔ یعنی برآمدہ میں شاید چپکے چپکے باتیں ہو رہی ہیں۔

آہستہ سے میں اُٹھی۔ دوسرے دروازہ سے چارپائی اڑی ہوئی تھی۔ چپکے سی اُس کے نیچے ہو کر میں رینگ کر دروازے سے کان لگا کر سُننے لگی۔

جو کچھ بھی میرے کانوں نے سُنا وہ میرے خون کو جما دینے کے لئے کافی تھا میری عزّت! میری آبرو! سب کچھ خطرہ میں تھی! میں اسی طرح کان لگائے سُن رہی تھی۔

میں نے سُنا! خدا کی پناہ! میں نے اپنے کانوں سے سُنا کہ اِن دونوں میں یہ معاملہ درپیش ہے کہ ان دونوں میں سے کون میرے......!

خدا کی پناہ! ایک نوجوان اور بیکس لڑکی کی عزّت خراب کرنے کے لئے دو خونی درندے سازش کر رہے تھے.... میں نے پھر غور سے سُنا۔ دو درندے میرے خلاف بدترین سازش کر رہے تھے، میں نے کیا سُنا؟ الفاظ نہ تو دُہرائی جا سکتے ہیں اور نہ دُہرائے جانے کے قابل ہیں بلکہ سننے ہی کے قابل نہیں! وہ الفاظ

جو انسانیت کے لئے باعثِ شرم ہیں! سیاہ بخت، اور بدچلن، اور آوارہ منش نوجوان دُنیا کے بدترین جُرم کرنے کی سازش کر رہے تھے۔

میں اسی طرح کان لگائے سُن رہی تھی۔ اور میں نے سُنا کہ ساتھ ہی پاکبازی اور راست بازی اور شرم و حیا کے لاینحل مسائل بھی درپیش ہیں۔ معلوم ہوا کہ بدترین ظلم اور بدترین جُرم کے لئے بھی پاکبازی اور شرم و حیا نے کچھ قواعد مقرر کئے ہیں ایک ایسے ظالم کے لئے بھی کچھ قواعد ہیں۔ وہ شرم و حیا اور پاکبازی کا قائل ہو اور شرم و حیا کا جذبہ اُس میں بدرجہ اتم موجود ہے! وہ قواعدِ پاکبازی اور حیاداری کیا ہیں؟

میں نے غور سے اِن تمام قواعد کو سُنا اور ان پر مُدلّل بحث سنی، مجھے معلوم ہوا کہ اِن دونوں نوجوانوں میں سے اگر ایک اس قدر بیحیا اور بے شرم اور ننگِ انسانیت ہے کہ تجویز کر رہا ہے کہ دونوں کے دونوں اس خوفناک جُرم میں حصّہ لیں اور اس طرح ثابت کر دیں کہ شیطان کوئی چیز نہیں۔ خباثت کوئی شے نہیں۔ درندگی اور حیوانیت کوئی چیز نہیں اور جو کچھ بھی ہیں وہ ہم ہیں! ..... مگر ذرا غور کیجئے کہ اگر ایک اس درجہ بیحیا اور بے شرم اور خوکِ مجسّم تھا تو دوسرا

بالکل ہی بے شرم اور پاکبازی کا مجسّمہ! اُس نے اس تجویز کی خباثت اور شیطنت کا ایک عجیب و غریب طریقہ سے اعلان کیا! اُس نے دوسرے پر نفرین کی اور اُس کو فلسفیانہ طریقہ سے کچھ اصول ذہن نشین کرائے یعنی اس نے اپنے خبیث دوست سے کہا کہ اس کے نزدیک ایسی عورت دوست کی محترم ہو جاتی ہے اور اسی درجہ قابل احترام ہے جس درجہ کہ منکوحہ عورت ہو سکتی ہے! یعنی دوست کی دست اندازی اس کے لئے ہر قطّامہ۔ ہر حرّافہ یا ہر مظلومہ کو وہی ارفع و اعلیٰ درجہ دیدیتی ہی جس درجہ کا صرف بیاہتا بیوی کو پبلک نے مستحق مانا ہے۔ قصہ مختصر اس کے پاکبازی اور حیاداری کے فلسفہ کا لُبّ لباب یہ تھا کہ اگر کسی قطّامہ یا حرّافہ یا مظلومہ پر دوست کی نظر التفات پڑ گئی تو اس کے نزدیک وہ دوست کی ناموس ہو گئی۔ اور وہ قابل احترام ہے! اور شرافت در اصل اسی کا نام ہے۔

---

یا میرے اللہ! میرے تمام ہوش و حواس زائل ہو گئے۔ میں وہ سُن رہی تھی جس کے سُننے سے بہتر ہے کہ کسی کنواری لڑکی کے کانوں میں پگھلا کر گرم گرم سیسہ ڈال دیا جائے! شاید یہ میری ہی قسمت کا حصّہ تھا۔ اپنی ہی آبروریزی اور تباہی کی تجویز سُنوں اور اس پر ردّ و قدح ہو۔ اور یہ سب کچھ میرے کانوں میں پہنچے!

یہ سب کچھ میری انوکھی اور قابل تقدیر کا حصّہ تھا۔

میں شاید ایک دم سے پاگلوں کی طرح چیخنے کا ارادہ کر رہی تھی! اندیشہ ہو رہا تھا کہ شاید انتہائی صدمہ اور کرب کی وجہ سے بیہوش ہوئی جا رہی ہوں! دماغ میں جیسے کوئی لوہار اپنا گھن چلا رہا تھا جس کی ضربوں سے دل ہل رہا تھا۔

ایک دم سے میری آنکھوں پر جیسے تیرہ و تار گھٹائیں جھوم کر آئیں! پردے آنکھوں کے چیر کر خوفناک تاریکی سچ مچ اندر گھس گئی۔ رات کی مہیب اور منحوس تاریکی معہ میری سیاہ بختی کے کچھ سنتے ہی میری آنکھیں چیر کر گھس گئی! جو کچھ بھی سُنا اُس کے سنتے ہی سر چکرا گیا! ہوش زائل تو تھے ہی بس مُردنی چھا گئی! وہ مُردنی جو ایک بخیطا مُلزم کے اُوپر موت کا فیصلہ سُن کر چھا جاتی ہے۔

شیطنت اور خباثت گویا انسانیت اور شرافت کا مُنہ چڑا رہی تھی! .....

میں نے اپنی تقدیر کا خونی فیصلہ خود اپنے کانوں سے سُنا!

مگر شاباش ہے ان خبیثوں کو جو با وجود اپنی بد باطنی اور خباثت کے قواعدِ مہمانداری کے قابل تھے۔ ایک مہمان تھا اور دوسرا میزبان تھا۔ بحث اِس طرح ختم ہوئی کہ میزبان نے نہ صرف مہمان کا فلسفۂ شرم و حیا سمجھ لیا (جس کی رُو سے ہر قطامہ یا مظلومہ دوست کی ناموس ہو سکتی تھی)، اور ساتھ ہی بربنائے

روایاتِ مہمانداری اپنے معزز اور پاکباز مہمان کی مدارات اور مہمانداری کی فرائض سے اس طرح سبکدوشی حاصل کی کہ خود میرے وجود سے بے تعلق ہو کر مہمان سے کہہ دیا کہ "تم میرے مہمان ہو اور تم جانو اور تمہارا کام"۔

قصہ مختصر یہ تھا فیصلہ جو میں نے اپنے کانوں سے سُنا کہ اب یہ مہمان ہے اور میں ہوں۔

# دربَرِبلا

اُدھر میں نے یہ آخری فیصلہ سُنا اور اُن کے اُٹھنے کی آہٹ محسوس کی، اور اِدھر میں تیزی سے چارپائی سے رینگ کر نکلی۔ زمین سخت اور آسمان دور باده مضمون میرا تھا۔ میں نے ہر چہار طرف سے خطرہ کی بُو کو سونگھا۔ کمرے کی سخت دیواروں سے میری نظریں ٹکرا کر لوٹ آئیں اور میں نے لالٹین کی طرف نظر ڈالی۔ دفعتاً مجھے پھُریری سی آئی۔ اس مختصر کمرے میں لالٹین کی بتّی کی روشنی مجھے معلوم ہوا کہ جیسے شیطنت اور خباثت کا اہرمن میری لاچاری اور سیاہ بختی پر ہنس رہا ہے! یہ روشنی نہیں ہے بلکہ ایک نہایت ہی مکروہ اور بھیانک صورت میں ایک خندۂ مسلسل ہے! ........ ایک نفرت انگیز خندۂ مسلسل کا منحوس تخیل! ...... نہایت ہی خوفناک!

تن بدن میں خوف اور دھڑکے کا جادو تیر گیا! ایک لرزش سارے بدن پر طاری ہو گئی! سانس سینے میں رُکتی سی معلوم دی۔ دم گھٹتا سا محسوس ہوا۔

ایک دم سے میں نے ہانپ کر اُس کمرہ کی کھڑکی کھولی۔ جو واحد راستہ مکان کی پُشت کی طرف معلوم ہوتی تھی۔ کھڑکی کھول کر میں اُس میں سے باہر کودنے ہی کو تھی کہ بجلی کی تڑپ کے ساتھ ایک فولادی پنجہ تاریکی سے جھپٹ کر پہونچا ...... ایک چیخ کے ساتھ میری طرف سے پُر زور کش مکش، اور اُدھر سے ایک شہ زور آدمی کے فولادی ہاتھ کا جھٹکا۔ ایک زور کے دھکّے سے میں چیخ کر اندر پلنگ پر گری اور قبل اس کے کہ میرے منہ سے دوسری چیخ نکل سکے، یا میں سنبھل سکوں۔ میرا گلا خونی پنجہ کی گرفت میں تھا۔

حملہ آور نے دوسرے ہاتھ سے کھڑکی جو بند کرنے کی کوشش کی تو میں پھڑپھڑا کر پنجہ سے نکل گئی۔ مگر کھڑکی مضبوطی سے بند کر کے وہ جلاد میرے سر پر !

میرے سامنے ایک تپائی آ گئی اور اب جان پر کھیل کر میں نے وہ تپائی اٹھائی۔ اور اس کا حربہ بنا کر میں نے خوں فشاں آنکھوں سے اپنے حملہ آور کو دیکھا۔ بجائے ڈر کے میرے تن بدن میں غصّہ کا جوش تھا اور مرنے مارنے پر

میں تل گئی۔ تپائی کا حربہ تان کر میں نے ڈپٹ کر کہا "بدمعاش ........ دُور ہو.... سر پھاڑ دوں گی۔ خبردار جو آگے بڑھا .......... شیطان کہیں کا"

میری ہمت مردانہ اور مجھے اس طرح آمادہ دیکھ کر وہ کچھ جھجک سا گیا کہنے لگا:۔

"تمہارا چیخنا، غل مچانا بیکار ہے"

آنکھیں نکال کر اور دانت پیس کر میں نے کہا "بزدل کہیں کا۔ کمینہ۔ کیسا چیخنا اور غل مچانا۔ ہوش میں آ۔ بھیجا پھاڑ دوں گی۔ تو نے سمجھا کیا ہے"

اُس نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم یوں نہ مانو گی" اتنا کہہ کر کچھ آگے بڑھا۔

"خبردار!" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ اور تپائی کو بلند کیا۔ مگر چشم زدن میں وہ انتہائی سُرعت کے ساتھ میرے اوپر حملہ آور ہوا۔ میں نے پوری قوت سے تپائی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر اس کے سر پر ایک زبردست وار کیا۔ اس نے ہاتھوں سے تپائی کو روکا۔ مگر میرا ہاتھ بھرپور پڑا تھا اور اس کے

تپائی کی ضرب پوری لگی۔ اور وہ چکرا کر بائیں طرف کو گرا۔ تڑپ کر اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر ہاتھ بے بس مار کر رہ گیا۔ میں نے غور سے اب اُسی چارپائی پر کھڑے دیکھا۔ کروٹ کے بل اوندھا پڑا ہوا تھا۔ ایک دم سے مجھے پھُریری سی آئی۔ کیونکہ اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں کچھ خوف زدہ سی ہو گئی۔ "کہیں مر تو نہیں گیا"۔ معاً میرے دل میں خیال آیا۔ وہ اسی طرح بیجان پڑا تھا۔ اور اب آہستہ سے چارپائی پہ بیٹھ کر اُس کو جھک کر دیکھا، وہ اسی طرح بیجان تھا۔ اب میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہ تو میں جانتی ہی تھی کہ مرا تو ہے نہیں۔ ہاں بیہوش ضرور ہے اور موقع ہے کہ میں کھڑکی کھول کر بھاگ جاؤں۔ یہ سوچ کر میں تیزی سے پلنگ پر سے اُتری اور بڑھی کہ برابر والی پلنگ پر چڑھکر کھڑکی کھول کر باہر کود جاؤں۔

---

میں اس طرف بڑھی ہی تھی کہ اس کے منہ سے کچھ پھنسی پھنسی اور سانس گھٹنے کی آواز سی آئی۔ میں رُک گئی اور میں نے مُڑ کر دیکھا کہ سانس بار بار جھٹکے کھا رہا ہے۔ "مر رہا ہے"۔ میں نے گھبرا کر دل میں سوچا اور قریب آکر کچھ پریشان ہو کر میں اُسے دیکھنے کو جھکی۔

میرا قریب آ کر جھکنا تھا کہ ایک جست کے ساتھ اس مکار نے مجھے اچھل کر داب لیا! میرے منہ سے چیخ نکلنا دوبھر ہو گئی۔ اور آہنی پنجہ کی انگلیوں سے میرا گلا گھٹتا ہوا معلوم ہوا۔ مگر میں نے بھی بے قابو ہوتے ہوتے اس کی انگلی میں زور سے کاٹ کھایا۔ ..... اور اُس نے اب انتہائی ظلم کے ساتھ مجھے بالکل بے بس کر کے اور بھی زور سے میرا گلا دابا اور میری چادر کا کونہ میرے منہ میں ٹھونسنا چاہا۔ لاکھ میں نے زور لگایا مگر کہاں ایک سولہ سال کی کمزور لڑکی اور کہاں ایک کڑیل جوان۔

میں نے بہت کچھ دانتی بھینچی اور منہ بند رکھنا چاہا۔ مگر اُس نے دوسرے ہاتھ سے اس زور سے میرے رخساروں میں اپنی خوفناک انگلیاں گڑائیں کہ منہ خود بخود کھل گیا۔ اور اُس نے میرے منہ میں اس بیدردی سے کپڑا ٹھونسنا شروع کیا کہ میرا سانس رک گیا۔

منہ میں کپڑا اچھی طرح ٹھونس کر اپنے مضبوط ہاتھوں سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور مجھے چھوڑ دیا۔

"جان سے مار ڈالوں گا" اُس نے دھمکی دیکر کہا "اگر ذرا بھی آواز نکالی تو خیر نہیں۔ گلا گھونٹ کر خاتمہ کر دوں گا۔ بیٹھ سیدھی"

یہ کہہ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اُس نے میرے ہاتھ چھوڑ دیئے اور کہا "خبردار جو کپڑا منہ سے نکالا"۔ یہ کہہ کر مجھے گھونسہ دکھایا تاکہ میں منہ سے کپڑا نہ نکال سکوں۔

میں نے اپنا ہاتھ اپنے منہ کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ پوری قوت سے اُس ظالم نے میری کنپٹی پر اس زور سے ہتھیلی کا تھپیڑا مارا ہے کہ میں چکرا گئی اور ساتھ ہی ایک ڈانٹ بتائی۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ سختی اور زبردستی بھی کوئی چیز ہے۔ میں نے اب اس ظالم کو اچھی طرح دیکھا۔ کوئی بائیس یا تئیس سال کی عمر ہوگی۔ مضبوط الاعضا اور قوی نوجوان تھا۔ گورا رنگ۔ چمکدار بڑی بڑی مگر خونی آنکھیں۔ صورت شکل اور ناک نقشہ بہت بھدا۔ چہرہ سے جبر پسندی عیاں تھی۔

میں نے سر جھکا کر ہاتھ جوڑے۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ میرا دم گھٹا جا رہا تھا اور جی اُلٹا آ رہا تھا۔ اشارہ سے میں نے بتایا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے کپڑا منہ سے نکال دو۔

اُس نے کہا "خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر چیخو گی تو گلا گھونٹ کر ختم کر دوں گا، ورنہ . . . (یہ کہہ کر اُس نے جھپٹ کر ایک چاقو اُٹھایا اور مجھے دکھا کر کہا) . . . اس سے ذبح کر کے ڈال دوں گا۔ تمہاری چیخ پکار کوئی نہیں سن سکتا۔ وعدہ کرو

کہ چیخو گی نہیں۔"

میں نے سر ہلا کر خاموشی کا وعدہ کیا۔ اُس نے مجھے پھر چاقو دکھایا، اور دھمکی دیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میرے منہ کا کپڑا نکالا۔ اور کہا کہ "تم ڈرو مت میں تمھیں کچھ تکلیف نہ دوں گا۔"

مُنہ سے کپڑا نکالتے ہی میں رونے سے بے حال ہو گئی اور میں نے اپنا سر جھکا کر چادر سے منہ لپیٹتے ہوئے کہا "خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دیجئے۔"

"تم گھبراؤ مت۔" آہستہ سے اُس نے اپنی پیشانی کے زخم کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم کُلّی کر کے پانی پیو، اور انسانیت سے بیٹھ کر باتیں کرو۔ ڈرو مت۔"

یہ کہہ کر اُس نے مجھے پانی دیا۔ میں نے کُلّی کر کے پانی پیا اور اُس کے بعد پھر منہ لپیٹ کر اسی طرح رونا اور ہاتھ جوڑ کر خوشامد شروع کی۔

اُس نے پوچھا "تم کون ہو؟"

میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔

اُس نے پوچھا "تمھارے والد کا کیا نام ہے؟"

اب میں نے دل میں سوچا کہ نام بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ خیال آیا کہ بےعزتی

کرنے والا میرے ماں باپ کا پتہ لگا کر اُن کو بھی ذلیل اور رُسوا کرنا چاہتا ہے میں ہرگز نہیں بتاؤں گی۔ اگر اس موذی نے مجھے بےعزت کیا تو میں جان دیدونگی۔ اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ اس کے ماں باپ کون تھے۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں چُپ کی چُپ رہی۔ اور کچھ نہ بولی۔ مجھے خاموش دیکھکر اس نے پوچھا "تمھاری شادی ہو گئی ہے ؟"

میں نے کپڑے میں مُنہ چھپائے ہوئے آنکھ کے گوشہ سے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس نے دوبارہ زور دے کر یہی سوال کیا تو میں نے کچھ سوچکر سر ہلا کر نفی میں جواب دیا کہ شادی نہیں ہوئی ہے۔

اِس کے بعد میرے شہر کا نام پوچھا۔ میں کچھ نہ بولی تو اس نے پھر پوچھا کہ "تم کہاں جانا چاہتی ہو؟" اس کے جواب میں میں نے اس مقام کا نام بتایا جہاں جا رہی تھی۔ اور کہا "خدا کے واسطے مجھے پہنچا دیجیے"۔

یہ مختصر تمہید تھی میری مُصیبت کے آغاز کی۔

---

بدکار اور مکّار کی عیّاریاں۔ خدا کی پناہ! وہ باتیں جواب اُس نے مجھ سے کرنا شروع کیں میں نے سُنی تو کیا، کہیں پڑھی بھی نہ تھیں۔ لفظ تھے کہ برچھیاں!

دل کٹ کٹ گیا۔ صدمہ سے پسینہ سا آگیا۔ گندے اور بازاری عشق و محبت کے دعوے اور تمام وہ مکروہ الفاظ جو عموماً آج کل کے کامیابؔ افسانہ نویس اپنے افسانوں میں دکھا سکتے ہیں۔

چنانچہ یہ تمام عفونت آمیز باتیں اُس کی طرف سے تھیں اور میری طرف سے؟ سوائے میری اپنی پاکبازی یا دیانت داری اور خوشامد اور خدا کے واسطوں کے کیا دھرا تھا۔ معہ تمام اُن خوشامدانہ حرکات و سکنات کے جو ایک بے رحم کے دل میں رحم پیدا کر سکتے ہیں۔

میری حالت کا اندازہ لگائیے۔ ایک نوجوان لڑکی بعد نسبت ہونے یا نکاح ہونے کے اپنی مخصوص نسوانی معصومیت کے ساتھ اپنی آنے والی خوش آیندہ متاہل زندگی پر کس اطمینان سے نظر ڈالتی ہے۔ تمام جذباتی دنیا سے خالی الذہن ہو کر وہ ایک عجیب و غریب دل خوش کُن تخیل میں ڈوب جاتی ہے۔ آئندہ زندگی کا دلخوش کُن سماں، اُس کی آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ وہ پیارا گھر جس میں وہ اور اُس کا عزیب شوہر دونوں آرام، چین اور سکون سے، ایک اطمینان کی زندگی بسر کریں گے۔ چنانچہ ایسی لڑکی پر یہ مصیبت پڑے تو اُس کی حالت ایسے وقت میں کیا

---

لہ معہ مصنف کے۔

ہو گی ؟ آئندہ زندگی کا خیال ایسے موقع پر دہاڑیں مار کر رونے پر مجبور کرتا ہے۔ پھر ایک وہ لڑکی جس کا نکاح ہو چکا ہو۔ میں سوچ رہی تھی کہ میرا نکاح نہ ہوا ہوتا اور میں کسی اور کی نہ ہو چکی ہوتی تو میں اس وحشی درندے ہی کو ایسے موقع پر قبول کر لیتی ضرور بالضرور اُسے راضی کر لیتی کہ تو جب مجھے چاہتا ہے تو ابھی دو گواہوں کو بلا اور مجھ سے نکاح کر لے۔ مگر موجودہ صورت ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ مجھے اپنی عزت نہیں بلکہ اس کی عزت کو بچانا تھا جس کی میں ہو چکی تھی۔ اور موجودہ صورت میں یہ ناممکن تھا کہ میں اپنی اور اس ظالم کی عزت ایک کر لوں۔ میں حیران تھی کہ الٰہی میں کیونکر اس ظالم سے اپنا پیچھا چھڑاؤں۔

قصہ مختصر میری خوشامد کے جواب میں اُس نے مجھ سے نکاح کے وعدے کئے، وہ کہتا تھا کہ نکاح پھر ہو جائیگا، اور میں کہتی تھی پہلے نکاح ہونا چاہیئے۔ میں جانتی تھی کہ وہ مکار ہے۔ اور وہ جانتا تھا کہ یہ عیارہ ہے۔ صبح ہوتے ہی اور چھوٹتے ہی پھر کاہیکو ہاتھ آئیگی ..

---

الغرض اس بحث اور گفت و شنید کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کی باتوں کا مجھے سختی سے جواب دینا پڑا۔ اُس کی ہر امکانی چالاکیوں کا میں جواب دے چکی تھی اور اپنی

بات پر قائم تھی اور اب مجھے سختی کرنا پڑی۔ اس کا لازمی نتیجہ اس کی طرف سے سچ مچ سختی کا ہوا۔ میری جھڑکی کے جواب میں اس کا فولادی پنجہ میری طرف دراز ہوا۔ میری طرف سے بھلا کیا کش مکش ہوتی۔ اس نے اپنی انگلیاں میرا گلا گھونٹنے کے لئے حلق پر جما دیں اور مجھے گرا کر اس زور سے گلا دبایا کہ سچ مچ میری آنکھیں نکل پڑیں۔ مگر گرفت ڈھیلی ہوتے ہی میں نے جو زور لگایا تو اُس نے مجھے قابو میں کر کے اور میرا گلا دبا کر اب بُری طرح مارنا شروع کیا۔

مگر میرے ارادے میں اب تک کوئی کمی نہ تھی۔ میں نے اپنے بائیں طرف چاقو پڑا دیکھا۔ میرا ہاتھ آزاد تھا اور میں نے اس بے بسی کے عالم میں چاقو جھپٹ کر بھرپور اُس کے مُنہ پر مارا۔ مگر میری قسمت خراب تھی، اوّل تو بائیں ہاتھ کا وار اور پھر کہاں میں کمزور لڑکی اور کہاں وہ طاقتور جوان۔ اُس نے سر ایک طرف کو کر لیا اور چاقو کی نوک اُس کے کان کو چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ اُس نے چاقو چھین کر دور پھینکا اور پھر جو میرے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کے بند کر کے مجھے بُری طرح مارنا شروع کیا ہے، تو سچ مچ مجھے مارتے مارتے بھُرتہ کر دیا۔ مگر میری پھر بھی وہی کش مکش تھی، حتیٰ کہ اُس نے

تنگ آکر ہاتھ مروڑ کر میری مشکیں پشت کی طرف دونوں ہاتھ کر کے خوب اچھی طرح دوپٹے سے باندھ دیں۔

میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا اس بُری طرح ٹھونسا ہوا تھا کہ سانس بند ہوا جا رہا تھا!

قصہ مختصر خالص قوت حیوانی، قوت نسوانی پر محض اپنی شہزوری کی وجہ سے غالب آگئی۔ جب ایک کمزور اور بے بس جسم کو مار کوٹ سے نیم جان کر کے مُردہ کر دیا گیا، گلا گھونٹ دیا گیا۔ کپڑا منہ میں ٹھونس کر تنفس روک دیا گیا...... سانس گھٹنے لگا۔ سوائے سر پٹخنے کے دوسرا چارہ کار نہ رہا۔ انتہائی صدمے اور سانس گھٹنے کی وجہ سے روح پرواز کرتی معلوم دی...... آنکھوں میں چکر آگیا۔ آخری مرتبہ میں نے سانس کی تکلیف سے زور سے زمین پر سر دے مارا......... سانس اور بھی زیادہ گھٹا...... آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ اور میں بیہوش ہو گئی اور وہ مضمون ہوا کہ مُردہ بدست زندہ!

میری آنکھ کھلی اور مجھے ہوش آیا تو میں نے اس وحشی اور ظالم کو اپنے

پہلو میں موجود پایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی تباہی پر میرے مُنہ سے ایک ضعیف سی چیخ نکلی اور میں پھر بیہوش ہوگئی۔

تمام وہ تکالیف جو ایک ظالم پہونچا سکتا ہے مجھے پہونچائی جا چکی تھیں۔

# تباہی

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن ۔ اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

"ظالم"!

اُف! یہ کس قدر مُہیب اور خوفناک لفظ ہے! خود ظالم شاید شیطنت اور خباثت کی ایک نہایت ہی خوفناک چیخ ہے۔

گندگی اور نجاست کا دیو........ گناہ اور مذلت کا خون آشام بھوت ........ اپنی انتہائی خباثت کی ترنگ میں آکر اپنا سفلی اور پلید ناچ شروع کرتا ہے!............ یا ایک ظالم اس خوفناک جرم کا ارتکاب کرتا ہے!

بیشک یہ ظلم اور یہ فعل، گناہ اور نجاست کے غلیظ دیوتا کا خبیث ترین

رقص ہے!

تمام کائنات کا ازلی نور........ بجھ جاتا ہے جب بدچلنی اور خونخواری ایک ظالم کے پنجہ میں کسی معصوم لڑکی کو سپرد کردیتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خدا کی سلطنت اُٹھ گئی اور یزداں پر (نعوذ باللہ) اہرمن غالب آگیا!

قدرت کاملہ شاید معطل ہوگئی! ورنہ کیا وجہ کہ چرخ نیلوفری اسی طرح اپنے محور پر قائم ہے! نظامِ عالم میں کوئی فرق نہیں آیا! دُنیا اسی طرح محوِ کار ہے! عابد اسی طرح اشک بار ہے! اور ظالم اسی طرح مسرور و مخمور ہے!

دُنیا اُسی رفتار پر ہے! کسی چیز میں کوئی فرق نہیں آیا! گویا یہ قیامت خیز حادثہ اپنے نتائج اور تاثرات کے لحاظ سے شاید میری ہی ذات تک محدود رہی کہ میری تو کائنات بدل گئی........ عزت و آبرو گئی...... کہیں کی نہ رہی۔ مگر دُنیا وہی دُنیا رہی!........ مگر سوال یہ ہے کہ کیا میرے لئے بھی؟.. ... ہرگز نہیں!

اپنی عصمت و عفت پر ڈاکہ پڑتے ہی میں خود دُنیا سے ایک الگ چیز سی ہو کر رہ گئی۔ خود میری ذات دُنیا کا بوجھ ہوگئی! ننگِ خاندان ہوگئی! باپ کی

دولت گئی تو شوہر کی عزت لُٹ گئی! مگر ظالم؟ ..... ظالم خود اِن تفکّرات سے بے نیاز اور آزاد ہے۔ وہ شیطان کا سپوت اور خباثت کا ولیعہد ہی اس کا یہ فعل خود اس کی نجس اور پلید زندگی میں واقعی ایک کارنامہ شمار ہونیکی چیز ہے۔

شیطنت کی چوکھٹ پر جبیں سائی ایک ظالم کا مذہبی فرض ہے اور اس بھینٹ کے لئے اگر کوئی بہترین تحفہ ہو سکتا تھا تو وہ میری عصمت اور عزّت ......... جسے ایک عقیدت مند پُجاری نے جبر و تشدّد اور ظلم سے حاصل کر کے شیطنت کے مندر پر چڑھا دیا!

---

میں نے دیکھا کہ پاکیزگی نے مُجھ سے مُنہ موڑ لیا ہے! ..... انسانیت شل ہو گئی ہے ......... معصومیت کو پھانسی دیدی گئی ہے اور اس کی لاش کو نجس اور گھناؤنے درندے بھنبھوڑ رہے ہیں!

نفاست اور نیکی کے فرشتہ کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا ہے اور اس کی متعفن لاش میں کیڑے بجبجا رہے ہیں ...... اور اس کی ہڈیوں کو نجاست اور عفونت کے کتے چچوڑ رہے ہیں۔

بس نہیں رو رہی تھی بلکہ عصمت اور عفت اور عزت اور آبرو خود اپنی میت

پر رو رہی تھیں !

---

اگر ہر پاک باز اور عصمت مآب دوشیزہ مجسم اسلام ہے تو اس کے ساتھ ظلم کرنے والا مجسم یزید ہے ! وہ یزید پلید جس نے کربلا کے خونی میدان پر دوشیزۂ اسلام کے ساتھ جبر کیا۔ جس نے دوشیزۂ اسلام کو اپنے آہنی پنجہ میں دبوچ لیا اور چاہا کہ اُس کی عِصمت دری کرے۔ . . . . . . وہ کامیاب ہوتے ہوتے رہ گیا . . . . . ذبح عظیم کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور یزید کے سے خونی زانی اور اسلام کے بیچ میں خونِ حسینؓ در آیا اور اِس قربانی کی بدولت دوشیزۂ اسلام کی عِصمت و عفّت بچ گئی اور دیکھتے کہ اس کی پیشانی پر وہی دوشیزگی کا نور ہے۔ اس کے عارضِ گلگوں پر وہی وحدت اور عصمت کی جھلک ہے۔ مگر آہ ! اس کی آنکھوں میں البتّہ خون ہے ! اور یہ تمام دُنیائے اسلام کے لئے ایک پیہم اور مسلسل درد ہے !

مگر میں ؟ . . . . . . یہ ایک سوال تھا . . . . . . میری آہیں خالی گئیں ؟ . . . . . میری فریاد کی کوئی شنوائی نہیں ؟ یہ ناممکن ہے ! مگر واقعہ تو

واقعہ تھا۔

جس طرح کربلا کا واقعہ باوجود یزید کی ناکامی کے دُنیائے اسلام کے لئے ایک ہیہم اور مسلسل درد ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ، ایک غریب اور معصوم لڑکی کا بے آبرو ہونا اس کے عزیز و اقارب کے لئے ایک ہیہم اور مسلسل درد ہے! وہ درد جس کی کسک دائمی ہے! وہ ٹیسیں جن کی تپکن سات پُشت تک نہیں جاتی۔ کسی کروٹ قبر میں بھی چین نہیں ملتا! لوگ قبر کو بھی دیکھ کر یہی کہتے ہیں کہ یہ اُس کی قبر ہے جس لڑکی کے ساتھ یہ ظلم کیا گیا تھا!
ایک کوڑھ اور کلنک کا ٹیکہ خاندان کی جبیں پر اَمِٹ ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ وہ موقعہ ہے کہ ایک مقنّن چیخ اُٹھتا ہے کہ سماجی قوانین نہ صرف سخت ہیں، بلکہ حد درجہ بیرحم اور ظالم۔

یہ سب کچھ تو ایک طرف۔ مگر اُدھر؟ ظالم کے چہرے پر فرطِ انبساط سے کامرانی اور خوشدلی عیاں! اُس کا دل حیوانی لذات و جذبات کے نشہ سے چور ہے اور وہ ساری کائنات کو اِس شادمانی اور اطمینان سے دیکھتا ہے کہ جس طرح ایک مکھی اپنے نجاست آلود جسم کو لے کر حلوائی کی دُکان پر بیٹھ کر یہی سوچتی ہے کہ یہ دُنیا اور یہ حلوائی، تمام اسی لئے مجبور و مامور کئے گئے ہیں کہ میرے لئے

دکان لگائیں اور سب سازوسامان میرے ہی لئے ہے۔

میں نے سوچا کہ میں کیا تھی اور اب کیا ہوں؟ میری تخلیق روز ازل اسی دن کے لئے ہوئی تھی کہ میں عین اپنے عنفوان شباب میں کسی ظالم کی ستم آرائیوں کا نشانہ بنوں۔

میں اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ قبل کھلنے کے اس پھول کی طرح توڑکر ایک پلیگ زدہ نعش کی زینت بنوں جو دراصل کسی غازی کے گلے کے ہار کے لئے تجویز کیا گیا تھا!

قصہ مختصر میں تباہی اور بربادی کے آغوش میں تھی۔ میری حالت کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ مندرجہ بالا تمام خیالات چشم زدن میں میرے دماغ میں پھر گئے۔ میں شاید اس کی منتظر تھی کہ اب آسمان پھٹ پڑے گا۔ نظام شمسی برہم ہوکر زمین کا طبقہ لوٹ دے گا۔ مگر حیف صد حیف کہ کچھ نہ ہوا اور میں اسی طرح اس ظالم کے آغوش میں تھی۔

---

میرا دماغ بیکار تھا۔ حواس زائل تھے۔ ہوش خطا ہو چکے تھے۔ قویٰ بیکار تھے۔ اعضا شل تھے۔ اور تمام قوتیں زائل ہو چکی تھیں اور میں اس خوشرد

نوجوان شیطان خصال کو دیکھ رہی تھی جس نے میرے لئے دُنیا ایک
"کرب و بلا" بنا دی تھی۔

اب کیا ہوگا؟ کہاں جاؤں گی؟ کسے منہ دکھاؤں گی؟ یہ سوالات تھے
اور ان کا واحد جواب بس موت تھی۔ موت ہی میرا درماں تھی۔

کس طرح میں پھوٹ پھوٹ کر اپنی تباہی و بربادی پہ رو رہی۔ اور وہ
شقی القلب کس طرح اپنی گندی محبت کے جھوٹے وعدے کر کے دلاسہ
نہیں دے رہا تھا بلکہ میرے زخمہائے دل پر نمک پاشی کر رہا تھا۔
میں درد بیکس تھی کہ صرف بیکسی؟ سوچئے ذرا۔

---

صبح ہوتے ہی وہ بندۂ خدا رخصت ہوا۔ یہاں سے بالکل ہی جانی
کے لئے۔ جلدی جلدی اس نے اپنا مختصر اسباب باندھا اور ایک آخری
خدا حافظ کے ساتھ رخصت ہوا۔

اس کے چلے جانے کے بعد ہی وہ شخص آیا جس کی میں مہمان تھی اور جس
کے دوست کی میں اب محترم ناموس تھی۔ اس نے مجھ سے رازدارانہ لہجہ
میں میرا پتہ وغیرہ پوچھا۔ اطمینان دلایا کہ راز فاش نہ ہوگا۔ میں نے

یہ الفاظ سنے اور زندہ تھی! مطمئن سی جارہی تھی اور زندہ تھی!

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اسٹیشن چلنے کی جلدی کی اور میں اپنے کو برقعہ اور چادر میں اچھی طرح لپیٹ کر گریاں و بریاں اسٹیشن پہونچی۔ میں ساری دُنیا کو متحیر ہو کر دیکھ رہی تھی کہ اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میری ذاتی تباھی سے ایک دُنیا بے غم تھی!

اسٹیشن پر پہونچ کر معلوم ہوا کہ بھائی صاحب کا ایک تار اسٹیشن ماسٹر صاحب کے نام آیا رکھا تھا جس کو انھوں نے وصول کر کے باحتیاط تمام رکھ چھوڑا تھا۔ اب جو میں آئی تو انھیں اس کا خیال آیا۔ اور تار پڑھنے سے معلوم ہوا کہ وہ مجھے لینے اب آتے ہی ہوں گے۔ میں مسافرخانہ میں بیٹھی اپنی قسمت کو رو یا کی!

# قصۂ ماضی

بھائی صاحب مجھے لینے آٹھ بجے والی گاڑی سے آرہے تھے اور اس وقت ساڑھے سات بجے تھے۔ میں مسافر خانہ میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ ایک تیرہ و تار مستقبل میرے سامنے موت کی سی سیاہی دکھا رہا تھا! پھر مرحلہ تو اب یہ تھا کہ بھائی صاحب آتے ہوں گے، وہ کیا کہیں گے (جیسے بیں ان سے سب کچھ کہہ ہی تو دوں گی)

وہی شخص یعنی اسٹیشن کا بابو آیا جس کے یہاں میں رہی تھی اور اس نے پھر اسی رازداری کے ساتھ کہا کہ "خدا کیواسطے کسی سے کہنا مت"!

یہ کہہ کر وہ چلا اور پھر لوٹ کر آیا اور جھک کر کہا "یہ کہہ دینا کہ رات کو آرام سے میرے گھر کی عورتوں کے ساتھ رہی تھی"!

وہ تو چلا گیا اور اب میں سوچ رہی تھی کہ بھائی صاحب سے بھلا کیا

کہونگی۔ ناممکن ہے کہ اصل واقعات اپنی زبان سے کہہ سکوں اور یہ بھی ناممکن ہے کہ انھیں دھوکا دے کر کچھ کا کچھ بنا دوں۔ لہٰذا یہ طے کیا کہ کچھ نہ بولونگی چپ ہو کر رہ جاؤں گی۔ یہ سوچتے ہی میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں خوب دل کھول کر روئی۔

---

بھائی صاحب آئے۔ کس قدر محبت سے انھوں نے کیفیت پوچھی۔ میں بھلا کیا کہتی۔ سوچی تھی کہ خاموش رہ جاؤں گی۔ مگر میری مکاری تو ملاحظہ ہو کہ میں نے اُن سے وہی کہہ دیا جو مجھے سکھایا گیا تھا یعنی یہ کہ مال گودام کے بابو کے یہاں کی عورتوں نے مجھے بڑے آرام اور سلوک سے رکھا! (عبرت)

انھوں نے میری غیر معمولی حالت دیکھی۔ کیونکہ سچ مچ میں نے بہت مار کھائی تھی۔ میں بھلا کیا جواب دیتی۔ نہایت ہی سوکھے مُنہ سے کہہ دیا کہ انتہائی پریشانی اور حیرانی اور سفر کی غیر معمولی تھکن کی وجہ سے یہ حال ہے۔ اس کے بعد وہ میرے سوتے رہ جانے کی حماقت پر سرزنش کرتے رہے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکا اپنی بریت میں میں نے پیش کیا۔ مختصر سا قصّہ سُنایا۔ پھر مال گے بابو کی گھر کی عورتوں کے اخلاق اور مہربانیوں پر نظر ڈالی کہ کس قدر انھوں نے

سب مُردوں کو مکان سے نکال دیا اور مجھے آرام سے رکھا۔ بھائی صاحب بھی آخر آدمی ہیں، کہنے لگے کہ میں بابو کا شکریہ ادا کرنے جاتا ہوں بڑا شریف ہے بیچارہ۔ میں کیسے روکتی اور وہ اس نالائق بابو کا شکریہ ادا کرنے گئے کہ میں اس لڑکی کا بھائی ہوں جسے تم نے رات بھر آرام سے رکھا تھا! یا میرے اللہ! کیا یہ سب عیاریاں اور مکّاریاں اسی ایک فعل کی بدولت نہیں کی جا رہی ہیں؟ یہ میں نے اپنے دل میں سوچا۔

بھائی صاحب تو گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ اور میں نے جھانک کر دیکھا کہ وہ مال بابو سے کس طرح بے جھجک مل رہے تھے۔ دیکھتے ہی جیسے میرے اوپر بجلی گری۔ بیحال ہو گئی، دل مسل کر رہ گیا، اس خیال پر کہ مال بابو ان کی طرف دیکھتا ہوگا اور دل میں کہتا ہوگا، کہ یہ اس لڑکی کے سگے بھائی ہیں اور کس شان سے اکڑ کر اور بل کھا کھا کر سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر اپنی شان جما رہے ہیں۔ درحالیکہ حقیقت مجھے معلوم ہے۔

مجھ سے آخرش یہ سین دیکھا نہ گیا۔ اور اب میں ایک اور بات سوچنے لگی۔ وہ یہ کہ میرا قاتل کون تھا! مجھے اس کا نام اور پتہ دریافت کر لینا چاہئے تھا۔ نطورو اشنہ آید بکار۔ نہ معلوم میرے اوپر اب کیا مصیبت پڑے اور معلوم

کیا پیش آئے ۔ خدا جانے کس روز بد کا سامنا ہو ۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو میں اس سے اُس کا نام دریافت کر لیتی ۔ اُس نے مجھ سے خط لکھنے کو کہا تھا ۔ اپنا پتہ لکھ کر دیا تھا اور جب میں نے لینے سے خاموش انکار کیا تھا تو اس نے خود اپنے ہاتھ سے میری واسکٹ کی جیب میں اپنی دو انگلیوں سے ٹھونس دیا تھا ، جو میں نے اس کے پیٹھ موڑتے ہی مل کر وہیں غصہ میں روند کر پھینک دیا تھا اور جوتی سے مسل ڈالا تھا ۔ مجھے اُٹھا کر رکھ لینا چاہیئے تھا ۔ مجھے دراصل اب اس کی محبت آمیز باتیں یاد آ رہی تھیں ۔ اس وجہ سے کہ میرا بس نہ تھا کہ اب اُسی کی ہو کر رہ جاؤں ۔ کسی طرح میرا نکاح ٹوٹ جائے ۔ مجھے طلاق مل جاتی اور میں اسی ظالم کے سر پڑ جاتی کہ کمبخت تو نے مجھے اب کہیں کا نہ رکھا ، اور نہ اب میں اور کسی کی ہو سکتی ہوں ۔ اور اب تو ہی سمیٹ مجھے ۔ اور رکھ اپنے پاس ۔ اب میں نے غور کیا تو اب میں سوائے اس کے اور کسی کے لائق ہی نہ تھی ۔ ایک دُنیا کیلئے بیکار تھی ۔ مجھے گھر جانا بھی گراں گذر رہا تھا ۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ یا تو مجھ موت آ جائے اور یا کسی نہ کسی طرح میرا نکاح توڑ کر مجھے اُس کے سر منڈھ دیا جائے ۔ مگر یہ اب کیسے ممکن تھا ۔ میرے پاس تو اس کا پتہ تک نہ تھا اس کا نام تک مجھے معلوم نہ تھا ۔ میں نے کیسی غلطی کی ۔

میں اسی سوچ میں غلطاں اور پیچاں تھی کہ گاڑی چیختی، چنگھاڑتی بل کھاتی، دندناتی اور دھواں نہیں، بلکہ میری تباہی پر ایک خوف ناک، اور حقارت آمیز تمسخر اُڑاتی اور قہقہے لگاتی پلیٹ فارم میں در آئی۔

بھائی صاحب نے مجھے لے جا کر زنانہ درجہ میں بٹھایا اور میں نے ایک کونے میں منہ لپیٹ کر اپنی تقدیر پر دل ہی دل میں رونا شروع کیا۔

دو چار مُسافر عورتیں بھی تھیں اور مجھے اُن سے آنکھ ملانا دوبھر ہو رہا تھا محض اس خیال سے کہ یہ بیچاریاں مجھے اپنی طرح سمجھتی ہوں گی اور یہ خیال بھی نہ کر سکتی ہوں گی کہ میرے ساتھ کوئی ظلم ہوا ہے۔

سفر میرا کوئی بہت طویل نہ تھا۔ چشم زدن میں کٹ گیا۔ میں آنکھ بند کئے ایک کونہ میں مُنہ چھُپائے چُپ چاپ بیٹھی رہی۔

---

ماموں صاحب کے گھر جب پہونچی تو سب لوگ مجھے "صحیح و سلامت" دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر ویسے بھی گھر کیا، بس یہ کہئے کہ خوشی کا اکھاڑا بنا ہوا تھا مجھے دیکھ کر خوش ہونے والیوں سے، میرا بس نہیں تھا کہ کہتی کہ خوشی نہیں بلکہ رونے کا مقام ہے۔

راستہ میں سوچی تھی کہ اپنی مصیبت کا حال کم از کم اپنی ماموں زاد بہن سے تو ضرور ہی کہہ دوں گی جس کی شادی میں آئی تھی۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ ناممکن ہے۔

لیکن بہت جلد سب نے محسوس کیا کہ میں غمگین اور ضرورت سے زیادہ غمگین اور اُداس ہوں یعنی اتنی غمگین اور اُداس کہ انھیں مجھ سے پوچھنا پڑا۔ میں نے سفر کی تکان اور پریشانی کا عُذر کیا اور وہ چُپ ہو رہیں، لیکن میرا غم یا میری اُداسی ایسی نہ تھی جو محض سفر یا پریشانی کی وجہ سے ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ پوچھنے والیوں نے شاید یقین نہیں کیا اور پھر پوچھا، میں نے پھر وہی جواب دیا تو پھر زور دے کر پوچھا۔ گویا یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر میں نے بھی زور دیکر اُن کو یقین دلایا کہ دوسری کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔ مجبوراً مجھے غور سے دیکھکر چُپ ہو گئیں۔ مگر میری اُداسی اس قدر غیر معمولی تھی کہ ماموں زاد بہن نے دو تین بار پوچھنے کے بعد پھر جرح شروع کر دی۔ لاکھ لاکھ اسے سمجھاتی ہوں کہ بہن کچھ نہیں مگر اُسے یقین نہیں آتا۔ وہ یہی کہتی ہے کہ "سفر کی تھکن نہ ہوئی ایک مصیبت ہو گئی۔ کہ ہنسنا بولنا تو خیر بند ہو گیا مگر یہ کیا کہ ایک دم سے تم تو سہم کر رہ گئی ہو

آخر معاملہ کیا ہے؟"

میں نے جس طرح بن پڑا اُسے خاموش کیا اور وہ چپ ہو گئی لیکن پھر موقع پا کر اُلجھ پڑی اور اب کے اُس نے صاف طور پر کہہ دیا "ہو نہ ہو بہن کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ کیا کسی پر عاشق ہو گئی ہو؟"

میں نے سچ مچ جل کر کہا کہ "کم بخت! تیری زبان کو آگ لگے۔ دولھن بنی بیٹھی ہے اور ہاتھ بھر کی زبان چلا رہی ہے"!

قصّہ مختصر میں نے خوب جھاڑا۔ مگر سب بے سود۔ کیونکہ وہ کیا۔ میری حوّنق شکل دیکھ کر سب کے سب میرے درپے ہو گئے، اور مجھے شادی کی شرکت وبال ہو گئی مگر میں انکار پہ انکار ہی کئے گئی۔

لیکن پھر بھی یہ جملے سُننا ہی پڑے "ایک دم سے یہ بُجھ کر رہ گئی!... ... .. نہ ہنستی ہے نہ بولتی ہے! آج گُم سُم کیوں ہے؟ یہ اسے کیا ہو گیا؟" وغیرہ وغیرہ۔

نوبت بہ اینجا رسید کہ میں نے بگڑنا شروع کیا اور دو ایک کو اچھی طرح لتاڑ دیا۔ مگر بھلا ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ میں اپنے غم میں مبتلا رہی اور شادی کی گھما گھمی مجھے ایک مصنوعی مجمع سا معلوم ہوا۔ ظاہر ہے کہ

میں نے کس طرح اس میں شرکت کی ہو گی۔

جب وہاں سے واپسی ہوئی تو میری جان جیسے آفت سے چھوٹی۔ میں سکون اور یکسوئی کی متلاشی تھی۔ اور شادی کی گڑبڑ میرا دماغ اڑائے دیتی تھی۔ مجھے پوری توقع تھی کہ گھر پر مجھے سکون قلب حاصل ہو گا۔ اور میں آئندہ کے لئے کچھ سوچ سکوں گی۔

---

گھر کو جائے سکون کی بجائے تکلیف کی جگہ پایا۔ دو چار عورتوں نے سر جوڑ کر میری طرف دیکھ دیکھ سرگوشیاں کیں۔ اور اس کے بعد مجھ سے الٹی سیدھی جرح کی۔ نتیجہ یہ کہ مجھے دل ہی دل میں قائل ہونا پڑا کہ ضرور بالضرور میری حالت میں اس قدر نمایاں فرق اس روز سے پیدا ہو گیا ہے کہ جو مجھے دیکھتا ہے وہ سوال کرنے اور خود میری طرف سے متفکر ہونے پر مجبور رہے۔

چنانچہ میں نے اپنے دل پر جبر کر کے اپنی خاموشی کو توڑ دیا۔ کونہ تلاش کرنے کی بجائے ایک مصنوعی بے فکری اور خوشدلی کے ساتھ باتونی بننے کی کوشش کی۔ ہر امکانی کوشش کی کہ سچ مچ جو کچھ گذرا ہے بھول

جاؤں اور بھلادوں ۔ چنانچہ فوراً یہی رویہ اختیار کرلیا۔

اس میں مجھے کافی کامیابی ہوئی ۔ دل نے بھی یہی کہا کہ جو ہونا تھا سو ہو لیا۔ اب اس کا سوچ کیا۔ دیکھا جائیگا۔ چنانچہ یہ سوچ کر محض دھیان بٹانے کے لئے اپنی سہیلی عارفہ کے یہاں چلی گئی ۔ وہاں سے واپس آکر دو چار روز کے لئے خود اُسے بُلالیا۔ پھر اس کے دو چار روز بعد مجھے بُخار آگیا۔ کوئی دس روز تک بُری طرح بیمار رہی، سر کے درد اور بُخار کے مارے مری جاتی تھی اور از خود سب کچھ بھول گئی ۔

بیماری سے جو اُٹھی ہوں تو گذشتہ واقعات بہت کچھ محو ہو چکے تھے۔ اور محو ہو رہے تھے ۔ اور اب اس طرف سے قدرے سکون تھا۔ بھول چکی تھی اور بھول رہی تھی ۔

بہت جلد بات آئی گئی سی معلوم ہونے لگی ۔ اور سچ مچ بھول گئی ...

..... عبث!

# دوسرا حصّہ

# تمہیدِ مصیبت

میں نے بڑی تندہی سے معاملہ کو "رفت گذشت" کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ کہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

میرا جرم پوشیدہ تھا۔ میں جرم کہوں گی کیونکہ میں اُس کو پوشیدہ رکھنے کی انتہائی کوشش کر رہی تھی۔ اور کسی طرح اس کو ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی۔ قصہ مختصر میرے تاریک اعمال پر رازداری کی خاموش چادر پڑی ہوئی تھی۔ غم کبھی کا ہلکا ہو چکا تھا ا ضمیر کی تابندگی ماند پڑ چکی تھی بلکہ فنا ہو چکی تھی وہی ضمیر جو کبھی کہتا تھا کہ کس طرح تو اپنے عزیز اور محبت کرنے والے وفادار شوہر سے آنکھ ملائے گی؟ کس منہ سے بعد شادی اس کے سامنے جائیگی

وہی ضمیر اب آزمودہ نسخے بنا رہا تھا! خاموشی اور مکاری ایسی چیزیں ہیں کہ وہ غریب شوہر کے باپ کو بھی پتہ نہ چلے گا کہ یہ موتی سچے ہیں کہ جھوٹے۔ خیال کہ اپنے عزیز شوہر کے پیروں پر گر کر ساری داستان غم رو رو کر بیان کر دوں گی۔ کسی سے نہ کہوں گی مگر ہاں دنیا کی عزیز ترین ہستی یعنی شوہر سے سب کچھ ضرور بالضرور کہوں گی۔ اور اپنی معصومیت اور ظلم کی کہانی انہیں سناؤں گی۔ کیا عجب کہ وہ رحم کریں اور معذرت قبول کریں۔ غرض یہ خیال کبھی کا دل سے نکل چکا تھا۔ اب تو یہ سوچتی تھی کہ اسی طرح شوہر سے بھی اس راز کو پوشیدہ رکھوں گی۔ جس طرح اوروں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ میری اس میں کچھ خطا نہیں اور مجبوری ہے! میں معصوم ہوں اور میرا دل معصوم ہے۔ میں بے شک اپنے شوہر سے بغیر آنکھ جھپکائے مل سکتی ہوں۔ کیونکہ میں سچ مچ ذرہ بھر گنہگار نہیں ہوں۔ اور کوئی خاص ضرورت نہیں جو یہ "دکھڑے" شوہر کے سامنے بیٹھ کر خواہ مخواہ روئے جائیں چنانچہ اب یہ معاملہ طے تھا۔ مصیبت کو برداشت کر کے بھلا بھی چکی تھی کہ اور ہی معاملہ درپیش آیا۔

میں بالکل غافل تھی اور سب کچھ صفحۂ دل سے محو ہو چکا تھا کہ شکوک و شبہات کے منحوس بادل اس طرح اُمنڈ کر آئے کہ میں سہم کر رہ گئی۔

کچھ شبہ سا ہوا کہ کہیں کوئی خاص بات تو نہیں۔ جوان لڑکی اگر اپنی طبعی رفتار میں اگر کچھ فرق محسوس کرے تو کوئی خاص بات نہیں مگر ایسے موقع پر جبکہ وہ میری طرح واقعات کا سامنا کر چکی ہو تو طرح طرح کے شبہات آنا لازمی ہیں، رہ رہ کر ڈر سا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں کچھ اور بات تو نہیں ہے۔ چنانچہ بیٹھ کر اچھی طرح حساب لگایا۔ سوچا۔ غور کیا۔ دن گنے تو اور بھی شبہ ہونے لگا۔ پریشان سی ہو گئی۔ دل کو طرح طرح کے حساب لگا کر سمجھایا۔ مگر شُبہ نہ گیا۔ بڑی غلطاں و پیچاں ہوئی۔ دل میں سوچی کہ لاؤ عارفہ تو اپنی رازدار ہے، اس سے کیوں نہ کہہ دوں سب حال؟ چنانچہ یہ طے کر کے اس کے گھر گئی۔ کہنا چاہا، اور بار بار ارادہ کیا۔ بلکہ کئی دفعہ تو صرف زبان پر آ کر رُک گیا۔ قصّہ مختصر کسی طرح کہتے نہ بن پڑا۔ بہت کچھ پیچ و تاب کھائے اور بہت غور کیا مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ پھر آپ ہی آپ چار چھ دن بعد خیال جاتا رہا۔ پریشانی خود ہی دُور ہو گئی۔ پوچھ گچھ سے اپنا اطمینان کر لیا۔ دل کو سمجھا لیا کہ بااوقات ایسا بھی ہوتا ہے کوئی خاص تعجّب کی بات نہیں۔ نتیجہ یہ کہ

بہت جلد بات آئی گئی ہوگئی۔ دو چار روز اور گذرے اور خیال بھی نہ رہا۔ دن گذرے اور ہفتے گذرے۔ خود اپنے وہم پر ہنسی آئی اور پختہ یقین ہوگیا کہ محض خالی خولی وہم ہی تھا۔

---

مگر جناب واقعہ تو پھر واقعہ ہے۔ آخرش وہ وقت آیا کہ پھر شبہ پیدا ہوا میں گھبرا گئی۔ الٰہی اب میں کیا کروں۔ جو دن گذرتا پہاڑ معلوم ہوتا۔ قصہ مختصر شبہ بدرجہ یقین کو پہونچا اور میرے دل نے گواہی دی بالکل سچ سچ ثابت ہوگیا۔ کہ واقعہ پھر واقعہ ہے کیونکہ صاف قرائن موجود تھے کہ خدا کو منظور نہیں جو میری لاج رہ جائے! پردہ فاش ہوگا! ذلت کا سامنا ہوگا! اصلی معنی میں آبرو ریزی اب ہوگی۔ سب کچھ کہنا پڑے گا۔ ماں اور باپ، بھائی اور بہن سب کو معلوم ہوگا کہ کس طرح میری دین و دُنیا خراب ہوئی ہے۔ یہ بات سارے خاندان کو معلوم ہو جائے گی۔ ہر کس و ناکس آنے جانے والا تک اس راز سے آگاہ ہوگا، یعنی اصلی معنی میں یہ راز طشت از بام ہو کر رہیگا! یہ تھا وہ تقدیر کا نوشتہ جو جلی قلم میں ایک خوفناک سیاھی کی تحریر بن کر میری آنکھوں کے سامنے کوند گیا۔

یہ تمام خوف ناک اور جاں گسل خیالات! خدائی پناہ! میری عزّت اور آبرو کا لاشہ پڑا تھا اور یہ خوفناک خیالات مُردار خور پرندوں کی طرح کس طرح نِشست باندھ کر اور جھوم جھوم کر اور چرخ کھا کر اس پامال لاشہ پر اُتر رہے تھے!

میں حیران و پریشان ہوگئی ایک دھڑکا سا لگ گیا۔ یا میرے اللہ! اب کیا ہوگا؟ آخر میں نے کونسی ایسی خطا کی ہے جس کی پاداش میں مجھے یہ سزا دی جارہی ہے! کیا خدا کی سلطنت سچ مچ غارت ہوگئی (نعوذباللہ) کیا بے گناہ کی یہی سزا ہے! ........ جو مجھے مل رہی ہے! ان خیالات کے ہجوم در ہجوم سے میں کچل کر رہ گئی۔ پامال ہو کر رہ گئی! پھر مرے پر سو دُرّے والا مضمون ہوا۔ یعنی خیالات نے اور بھی جاں گسل روانی کے ساتھ ایذا رسانی کی نئی شاہراہیں ڈھونڈیں۔

---

خیالات کا ہجوم در ہجوم خوفناک تخیل بن کر مجھے ستا رہا تھا۔ تمام وہ باتیں ایک ایک کر کے ذہن میں آئیں جو پیش آسکتی تھیں ........

والد صاحب جس وقت سُنیں گے کہ میری بیٹی کے ساتھ یہ ظلم کیا گیا ہی تو عجب

نہیں جو اپنے گولی مار لیں! ...... بالفرض اگر انھوں نے یہ نہ کیا تو ان کے
ملنے والے آئیں گے اور اُن سے ازراہِ ہمدردی اور اشارۃً اور کنایۃً
پوچھیں گے کہ آخر وہ کون موذی تھا اور کس طرح اُس نے تمھاری بیٹی کے ساتھ
یہ ظلم کیا؟ ........ بھائی صاحب کو معلوم ہوگا تب وہ کیا کریں گے!..
...... غیرت میں آکر کیا تعجب کہ مجھے بھی مار ڈالیں اور خود بھی اپنی جان
دے دیں۔ ........ محلہ میں چہ میگوئیاں ہوں گی! ........
اماں جان سے محلہ والیاں کیا کہیں گی! ......... دشمن اور حاسد
کیا کیا حاشیہ آرائیاں کریں گی! وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ یہ تمام خیالات میرے دماغ میں اس طرح بار بار آئے کہ روحی
تکلیف کی وجہ سے میں سچ مچ چیخ پڑی! اب مجھے معلوم ہوا کہ سوائے موت
کے دوسرا علاج نہیں۔ موت ہی ایک دوا ہے کہ یہ تمام کے تمام جھگڑے
نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طے کر دیگی! اس
کے علاوہ کوئی دوسری تدبیر نہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے طے
کر لیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کنواں گھر ہی میں موجود ہے لہٰذا اب بہترین صورت
یہی ہے کہ اس میں گر کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے باپ دادا کی عزت کو بچا لوں۔

اس تجویز پر گھنٹوں غور کیا۔ ہر طرح سے بہترین پایا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ اتفاقاً گر گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یہ قصہ ڈوب کر رہ جائیگا۔ بہت خوب تدبیر ہے۔ چنانچہ یہی طے کر کے دل کو اطمینان دلایا اور واقعی ایک سکون قلب حاصل ہوا۔ چنانچہ خیالات کی رَو میں اٹھ کر گئی فوراً کنوئیں میں جھانک کر دیکھا اندر تاریکی تھی مگر غور سے دیکھنے سے پانی کی جنبش نظر آئی۔ اور خیال جو ایکدم سے اس کی گہرائی کی طرف پہنچا تو دل لرز گیا۔ جھٹ سے ایک ڈولچی بھر کر چلی آئی۔

---

رات کا سنّاٹا تھا! اندھیری رات میری قسمت سے بھی زیادہ تاریک معلوم ہو رہی تھی۔ ایک ہیبت ناک خاموشی فضا میں مُسلّط تھی اور تاریک فضا میں منحوس تاروں کی چمک! ........ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے میرے اوپر سلاخیں اور بھالے مارے جا رہے ہیں!

میں نے اپنی چارپائی پر بیٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ ایک عجیب و غریب سنّاٹا طاری معلوم ہوا۔ میں نے والدہ صاحبہ کی چارپائی کی طرف کان لگائے اور سوائے جھینگروں کی مسلسل آواز کے ہر چہار طرف خاموشی ہی

خاموشی تھی۔

میں نے دل میں سوچا کہ موقع ہے۔ چنانچہ میں اٹھی۔ دبے پاؤں کنوئیں کی طرف بڑھی۔ کنوئیں کی منڈیر پر بھاری قدموں سے چڑھی۔ ایک دم سے آسمان کی خاموش اور تاریک فضا کی طرف نظر اُٹھ گئی، اور میں نے دیکھا کہ ایک ستارہ، ایک تڑپ کے ساتھ اپنی جگہ سے ٹوٹ کر غوطہ مار کر سیدھا میری سامنے فضا کی تاریکی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ میں بھی اب زندگی کی روشنی اور نوجوانی کی چمک اور دمک کے ساتھ، اس تارے کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کنوئیں کی خوفناک اور تیرہ و تار گہرائی میں ڈوبتی ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے ایک ناقابلِ بیان کوشش کے ساتھ کنوئیں کے اندر جھانکا۔

بس میرا کنوئیں میں جھانکنا ہی ایک قیامت ہو گیا! ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اندر کی خونی ہیبت ناک تاریکی سچ مُچ مجھے کھینچے لیتی ہے! کنواں نہیں بلکہ ایک خوفناک اژدہا ہے جو میری طرف مُنہ پھاڑ رہا ہے! ایسا ڈر لگا کہ بس ایک چیخ منہ سے نہیں نکلی، یہی غنیمت ہوا۔ کہاں کا ڈوبنا اور کیسا تیرنا! بھاگی بری طرح بدحواس ہو کر! بس یہ معلوم ہوا کہ کنواں ایک آدم خور اژدہا

ہے اور اپنی جگہ چھوڑ کر اب لپکا میری طرف! قصہ مختصر کس طرح میں بھاگی ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی۔ برآمدے کے کھمبے سے لگی میں کھڑی ہانپ رہی تھی۔ اور دل بلیّوں اُچھل رہا تھا اور میں اس تاریکی میں کھڑی اس طرح کنوئیں کی مَنڈ کو غور سے دیکھ رہی تھی کہ کہیں ہل تو نہیں رہی ہے۔ کہیں سچ مچ کنواں میری طرف مجھے نگلنے کے لئے آ تو نہیں رہا ہے!

---

جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو میں ہار کر اپنی چارپائی پر آ گئی کنوئیں میں گر کر مرنا تو بڑی بات ہے کنوئیں کی طرف دیکھنا مشکل ہو رہا تھا مگر مرنا مجھے سخت ضروری تھا۔ لہٰذا اب چُپکے چُپکے اُدوان کی رسّی کھولی پھندا بنا کر گلے میں ڈال کر آہستہ آہستہ جو دبا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بس یہ ٹھیک ہے۔ پھانسی دے کر مر جانا بہت ٹھیک رہے گا۔ مگر زور سے جو کسا ہے تو خدا کی پناہ! کس طرح پھڑپھڑا کر میں نے جلدی سے پھندا ڈھیلا کیا ہے کہ میری گردن چھل گئی۔ معلوم ہوا کہ مرنا دراصل سب سے مشکل کام ہے۔ چنانچہ تجویز اب یہ دل میں آئی کہ کہیں سے سنکھیا منگاؤں گی تب جا کر کام چلے گا۔ اسی سوچ میں دیر تک محو رہی اور پھر سو گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد خواب دیکھا۔ کتنا خوفناک خواب تھا۔ میں نے خواب
میں کنویں کو دیکھا۔ ایک سیاہ فام بلا تھی کہ جماہی لے رہی تھی اور میں سانس
کے ساتھ اُس کے مُنہ کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ کہیں
میں سانس کے ساتھ نہ کھنچ جاؤں سوتے ہی میں چارپائی کو زور سے پکڑ لیا۔
کہ ایک دم سے مجھے معلوم ہوا کہ کنواں میری طرف مُنہ پھاڑ کر نگلنے کو لپکا! بس
ایک دم سے سوتے ہی میں میرے منہ سے زور سے چیخ نکل گئی اور
میری آنکھ کھلی تو زور سے چارپائی کی پٹی پکڑے ہوئے تھی اور مارے ڈر
کے میری گھگی بندھ گئی۔ والدہ صاحبہ جاگ اٹھیں اور انھوں نے پوچھا
تو میں نے کہا کہ خواب میں ڈر گئی تھی۔
دوسرے روز صبح جو اُٹھی تو الجھنوں کے لئے راستہ سُلجھا ہوا ملا پھر
وہی ہجوم خیالات! پھر وہی تسلسل خیالات، اور ایک سے ایک نیا راستہ،
خیال تھا کہ اُڑا جا رہا تھا! کہاں کہاں پہونچ رہا تھا!
پھر اسی خیال سے شروعات ہوئی کہ میں نے بڑی بھاری غلطی کی جو
اس ظالم کا نام و پتہ مسل کر پھینک دیا۔ جب یہ راز کھلے گا اور سسرال
تک بات جائیگی تو کیا ہوگا؟ طلاق تم طلاق ہوگا، وہ مثل ہوگی کہ دھوبی کا کتا نہ گھر

نہ گھاٹ کا! مجھے کیا خبر تھی ورنہ میں اس کا پتہ احتیاط سے رکھ لیتی اور جب میری جان کو آفت آتی تو اسی کو پکڑتی۔

غرض کیا بتاؤں کیسی کیسی پریشان ہوئی ہوں، بس نہ تھا جو ابھی اُس ظالم کے پاس پَر لگا کر پہونچ جاتی، اور کہتی کہ او بیدرد تو نے میری دُنیا خراب کر دی، اب بتا کوئی تدبیر۔ یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ وہ انکار کر سکتا تھا۔ اور میری امداد نہ کرتا۔ وہ چور تھا۔ مجرم تھا۔ بھلا مجال ہے جو وہ انکار کر جائے۔

مگر اب اِن فضول خیالات سے کیا ہوتا تھا۔ میں تو اس بابو کا نام بھی نہ جانتی تھی۔ یہ ہجوم خیالات، اور ان کا خوفناک تسلسل، ایک نہایت ہی تکلیف دہ اور جاں گسل مگر جیتا جاگتا خواب ہو کر مجھے ایک متحرک اور مستزلزل مگر تخیل مآب بلا ہو کر چمٹ گیا کہ جوں جوں میں اس سے گھبراتی اور جان کو آتا اور دل اُلٹنے لگتا۔ لہٰذا اس تسلسل کو میں نے اس طرح توڑنے کی کوشش کی کہ صورتِ حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔

# حسنِ عصمت

اب یہ تو طے تھا کہ راز فاش ہوگا۔ خاموشی اور رازداری کی چادر کا تار تار ہونا یقینی تھا۔ اب نہ سہی بعد دو مہینہ کے تمام خاموشی اور فریب اور رازداری کے بادل چھنٹ جائیں گے۔ اور واقعات کی روشنی میں میری سیہ کاری اور پردہ داری کی دھجیاں اُڑائی جائیں گی۔ لہٰذا اب سوال تھا کہ یہ پردہ داری اور فریب کاری تا کئے؟ کیوں نہ میں عارفہ سے جلد سی جلد کہہ دوں! چنانچہ بہت غور و خوض کے بعد میں نے طے کر لیا کہ عارفہ سے کہدینا چاہیے۔

خوب اچھی طرح اور بار بار غور کر کے بھی طے کر لیا اور یہ طے کرنے کے دوسرے ہی روز عارفہ کے یہاں پہنچی۔

مجھے دیکھتے ہی عارفہ سمجھ گئی کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ کہنے لگی کہ "بہن کچھ نڈھال سی ہو رہی ہو۔ کیا معاملہ ہے؟ خیر تو ہے؟"

میں بیٹھ گئی اور بجائے جواب دینے کے میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ ایک کنواری اور پاک دوشیزہ تھی۔ عصمت اس کی آنکھوں میں تیر رہی تھی! عفّت اس کی پیشانی کے بوسے لے رہی تھی! وہ نور اس کی خوبصورت چہرے پر چمک رہا تھا جو ایک دوشیزہ کا امتیازی روپ ہے! اور میں؟ ......افسوس.....ایک کچلا ہوا شباب تھی۔ ایک روندی ہوئی، اور پامال شدہ جوانی! ایک مسلا ہوا پھول۔ جوتے سے مسلا ہوا! اور وہ بھی ایسا کہ جوتے کی نجاست پھول کی ہر پنکھڑی میں زہر کی طرح بس گئی تھی! خود میری طبیعت میرے ہی لئے باعث نفرت و امتلا تھی۔ میری اپنی طبیعت خود اپنے ہی لئے متعفن تھی۔ خود اپنی ہی بدبو سے میری جوانی شرمندہ تھی۔ میں گناہوں کی پوٹ اور معصیت کا پشتارہ تھی۔ شیطان کے وجود نہیں، بلکہ شیطان کی شیطنت اور اس کے خبیث ترین جبروت کا مکمل اور مسلسل اعلان تھی! مگر بخدا میں پھر بھی معصوم تھی۔

وہ نور جوانی جو ایک دوشیزہ کی جبین پاک پر ستارۂ سحری بن کر چمکتا ہے

...... وہ نورِ ازلی جس کی مُہر ہر دوشیزہ کے ماتھے پر قسامِ ازل کی طرف سے ثبت ہوتی ہے وہ عارفہ کی پیشانی پر جگمگا رہا تھا! جس کی شعاعوں کی تڑپ سے میری آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں! اور ادھر میری بدقسمت اور کھوٹی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ تھا۔ قصہ مختصر میں مجسّم آلودگی تھی اور میرے لئے عارفہ ایک مجسّم نور تھی۔

بجائے جواب دینے کے میں عارفہ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اور دیکھتے دیکھتے اُسے، میرا دل بھر آیا، آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں نے عالمِ بے اختیاری میں اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور اُس کو زور سے چمٹا کر اپنے دل کا بُخار نکالنا شروع کیا۔

وہ اس غیر معمولی بات سے گھبرا گئی۔ اس کے ہوش جیسے جاتے رہے اور ایک پریشان کُن لہجہ میں اس کے منہ سے نکلا "میری بہن ...." اور بھرائے ہوئے لہجہ میں اس نے گھبرا کر جو مجھے بڑی ملائمیت سے چھڑایا ہے تو میں نے دیکھا کہ اس کی پلکوں میں ہمدردی کے دو موتی لٹک رہے تھے۔ کس قدر متوحش صورت بنا کر اس نے مجھ سے پوچھا ہے "خدارا .... بہن

تجھے کیا ہوا؟"

اس کے سوال کے جواب میں میرے پاس آنسوؤں کی لڑیاں تھیں کہ بارش کا تار! ایک آہ کے ساتھ میری آنکھوں سے سچ مچ کی جھڑی لگ گئی۔ اور اسی حالت میں جس طرح بھی مجھ سے بن سکا اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ رُک رُک کر۔ ہچکیاں اور سسکیاں لے لے کر۔ رو رو کر اور ہل ہل کر اپنے دل پر صدمہ کے گھونسے نہیں بلکہ سچ مچ "پچھاڑ" مار کر۔ قصہ مختصر جس طرح بن پڑا اور جیسے ہو سکا اور ممکن تھا میں نے اس رازِ سربستہ کو عارفہ کے آگے کھول کر رکھ دیا۔ شروع سے لیکر آخر تک اس کو اپنی داستانِ درد سُنا ڈالی کس طرح ایک ظالم نے مجھے پکڑا۔ کس طرح میں اُس سے جان پر کھیل کر لڑی اور کس طرح اس سے خوفناک جنگ کی اور کس طرح وہ میرے اوپر غالب آیا اور کس طرح میں اس رازِ سربستہ کو بلی کا گُو بنائے رہی اور کس طرح اب خدا کی مرضی ہے کہ معاملہ طشت از بام ہوا! یہ میں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

---

میں اپنا قصہ بیان کرتی جاتی تھی اور اس خوفناک اثر کو دیکھتی جاتی تھی جو عارفہ کے چہرہ سے ظاہر تھا۔ اس نے کس طرح میری پوری کی پوری داستان

سناٹے میں آکر اور مبہوت ہو کر سنی، اور بعد مفصل طور پر سنانے کے میں نے اس کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ یہ دیکھنے کو کہ میں دیکھوں تو سہی کہ اس کی خوب صورت غلافی آنکھیں میں تمنا فرت کی سیاہی آتی ہے کہ ہمدردی کا نور......... میں نے دیکھا اور غور سے دیکھا۔ آہ! میں نے دیکھا کہ اس کی خوب صورت آنکھوں میں میرے خلاف نفرت کی سیاہی آگئی میرا دل بے قابو ہو گیا کہ ان آنکھوں میں ہمدردی کا نور گل ہو گیا! دل ایکا ایکی بھر آیا۔ طبیعت اُمنڈ آئی اور میں پھوٹ پڑی۔ رو کر میں نے کہا "بہن! میں قابلِ نفرت ہوں۔ مجھ سے جتنی بھی نفرت کرو کم ہے۔ مگر خدا کے واسطے غور تو کرو کہ مظلوم ہوں، فلک کی ستائی ہوئی ہوں۔ قابل نفرت ہوں تو قابل رحم بھی ہوں اور جب تم بھی آنکھیں پھیر لوگی تو میں کیسے زندہ رہونگی"!

میرا یہ کہنا تھا کہ عارفہ کی آنکھیں ہمدردی اور محبت کا پیالہ بن گئیں۔ جن میں سے دو آتشہ آخر کو چھلک گیا۔ ہمدردی کے سیلاب سے نفرت کی سیاہی دُھل گئی۔ وہ میری ہمدرد تھی۔ سچی اور محبت کرنے والی ہمدرد تھی، اور وہ نفرت کی سیاہی جو میں نے دیکھی تھی شاید ایک قدرتی چیز تھی، اس کے پاک اور صاف اور عصمت مآب باطن کے لئے شاید اس وحشیانہ ظلم کا ذکر ہی باعث امتلا

تھا۔ عصمت مآب طبیعت بھی دراصل کتنی حساس ہوتی ہے!

عارفہ کی طبیعت اس قسم کے تمام تذکروں کے لئے کنواری تھی۔ میرے قصہ کا بار اُٹھانا مشکل تھا۔ ویسے بھی نسوانیت اس قسم کی تعفن کی متحمل نہیں ہوسکتی کجا ایک پاک وصاف اور معصوم صفت عارفہ سی دوشیزہ! اس قسم کا تذکرہ کسی دوشیزہ کے سامنے دراصل اس کے عصمت مآب اور کنواری خیالات کی عصمت دری سے کم نہیں! ایک کنواری لڑکی کا دراصل تخیل بھی دوشیزگی کی بھینی بھینی بُو سے مُعطّر و مُعنبر رہتا ہے۔ اور پھر یہ ذکر تو بڑی چیز ہے شاید میرا اسانس بھی اس کے تخیل دوشیزگی کی شان میں ایک ناپاک گستاخی تھا۔

---

عارفہ نے سچی ہمدردی اور تشویش کے ساتھ معاملہ پر غور کیا۔ یہ شاید ایک بدترین معاملہ تھا جو ایک کنواری ہم جولی کے سامنے پیش ہوسکتا تھا۔

اس میں تو شک وشبہ کی گنجائش ہی نہ تھی کہ راز افشا ہونے کے پورے سامان ہو چکے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مہینے دو ایک اور یہ معاملہ چُھپا رہ سکتا ہے۔ لہٰذا سوال یہ تھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ مگر سچ پوچھئے تو

عارفہ بیچاری اس معاملہ میں کیا کر سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ گم سم ہو جائے۔ ایک سناٹے میں آجائے۔ یہ دراصل ایسا معاملہ تھا کہ اس کے صدمے اور دھچکے کو مظلومہ کے آس پاس بیٹھنے والیاں، اور سننے والیاں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ ایک مادّی صورت میں خود محسوس کرتی ہیں۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ جو وہ کر سکتی تھی اس نے کیا۔ یعنی اس صدمہ کی ہیبت اور دھڑکے کا صدمہ بے طرح محسوس کیا۔ بڑی دیر تک چُپ بیٹھی رہی۔ اُدھر وہ نہایت ہی معصوم نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، اور اِدھر میں مظلوم نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اور مظلومیّت اور معصومیت کی کہربائی آمیزش کی عجیب و غریب تاثر سے ایک ناقابل بیان جمود یا عارضی سکوت فضا میں مُسلّط معلوم ہوتا تھا۔

میں عارفہ کے پُرسکون چہرہ کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اپنی اور اس کی دونوں کی مجبوری و معذوری پر غور کر رہی تھی۔

غور کرنے کا مقام ہے سماجی قوانین کی بیرحمی تو دیکھئے کہ اگر کوئی دوشیزہ کسی بدکار کی ستم رانی کا شکار ہوتی ہے تو وہ خود اس راز کو پوشیدہ رکھنے

پر مجبور ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں وہ اس راز کو خود طشت از بام کر دیتی؟ کیوں نہیں وہ خود اس ظلم کی ٹہنی کو نوچ کر پھینک دیتی! پبلک کے سامنے! کہ دیکھو یہ نامراد ظالم ہے اس کو سزا دو۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی، مجبور ہے۔ کیونکہ وہ اگر کہیں ایسا کرے تو مجرم کو تو سوسائٹی ایک "حبذا الحادر! ہترا" کے ساتھ چھوڑ دے گی اور خود مظلومہ کو سخت سزا دے گی! وہ یہ کہ جھوٹے برتن کی طرح لوگ اُسے پھینک دینے اور پھوڑ مارنے کی چیز تصور کریں گے۔ سوسائٹی اس کی پیشانی کو بدنامی کے گرم لوہے سے داغ دے گی۔ نتیجہ یہ کہ اس سے کہدیا جائے گا کہ تو اس لائق نہیں کہ اُن اعلیٰ طبقہ کی خواتین کی ہمسری کا دعوےٰ کرے جنھیں کوئی زبردست ہاتھوں والا ظالم محض بر بنائے خوش قسمتی یا سوءِ اتفاق ابھی تک نہیں ملا ہے اور نہ آئندہ ملنے کی بظاہر کوئی خوش آیند امید ہے۔ وہ اس لائق نہیں کہ کوئی نوجوان اس کی طرف شادی کی نیت سے دیکھ بھی سکے۔ بلکہ اس کی طرف دیکھنا بھی معصیت اور آلودگی ہے۔ وہ قابل نفرت ہے اور گلے اور سڑے حصہ جسم کی طرح سوسائٹی اور خاندان سے کاٹ کر کوڑے پر پھینک دینے کے لائق ہے۔ یہ ہے وہ سزا جو ہمارا انصاف پسند قانون ایک سچی اور سیدھی اور انتہا سے زیادہ پاکباز

خاتون کو دیتا ہے!

ایسی صورت میں سوائے اس کے کیا چارہ کہ مظلومہ اپنا استغاثہ روزِ قیامت کے لئے اٹھا رکھے جب ظالم پکڑا جائیگا اور مظلومہ کی عصمت اس کارسازِ حقیقی کے آگے اپنی پامالی اور تباہی کی فریاد کریگی! اور وہ بھی ایسی کہ عرش کے کنگورے ہل جائیں گے۔ پیغمبروں کے دل پگھل جائیں گے اور سب دیکھیں گے کہ یہ وہ فریاد ہے جس میں دمِ عیسیٰ نے جان ڈال دی ہے الحنِ داؤدی نے رقت کے تار چھو دیئے ہیں اور اس میں وہ سوز ہے جو حق تعالیٰ نے شاید صرف مادرِ حسینؑ کی آہ کے لئے رکھ چھوڑا تھا!

---

اس جمود و سکوت کو بالآخر میں نے ہی توڑا۔ میں نے عارفہ سے رازدارانہ لہجہ میں پوچھا "کوئی دوا کھالوں؟" "دوا!" اس کے منہ سے بیساختہ نکلا۔ اور حرفِ شکایت بن کر فضا میں تیرتا چلا گیا۔ اس کا لہجہ کچھ شکایت کے ترنم سے لبریز تھا۔ اس نے اپنی نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا، اور اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اس قسم کی باتیں کس طرح اس کی طبیعت پر بار ہیں، پھر ویسے ہی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا مشورہ دے۔

بار بار میں نے اس سے مشورہ لیا۔ بار بار میں نے دوا کے بارہ میں جب اس سے پوچھا تو اس نے ایک عجیب بامعنی سادگی سے آہستہ سے مجھ سے پوچھا "تمھارے پاس ہے؟" اور یہ کہہ کر اس کی نظریں از خود نیچے جھک گئیں۔

اب مجھے خیال آیا۔ بھلا کون مجھے ایسی دوا لا کر دے گا؟ پھر دوا آ بھی گئی تو اس کا کھانا اور راز پوشیدہ رہنا! لہٰذا اس شکست کے بعد اب ظاہرا اور کوئی علاج نہ تھا۔ اور عارفہ نے ڈرتے ڈرتے یہ مشورہ دیا کہ چونکہ میری تقدیر واقعی خراب ہے اور بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور پھر میری اس میں کچھ خطا بھی نہیں۔ لہٰذا گھر والوں سے پوشیدہ رکھنا فضول ہی۔

اس لازمی مشورہ کو سُنکر مجھے ایک پھُریری سی آئی اور میں نے اس سے تنک کر کہا "کم بخت بھلا میں کس طرح سے اور کس سے کہوں۔ اگر مُلازمہ سے کہتی ہوں تو وہ گھر والوں سے کہنے سے قبل جا کر پڑوس میں پھونک دے گی۔ اور اس سے پہلے گھر والوں کو پڑوسی آ کر اطلاع دیں گے۔ خود کہنا ناممکن۔ تُو کہہ نہیں سکتی۔ آخر بتا تو سہی کہ کیسے اور کس سے کہوں؟"

اب اِس کی تدبیر اُس کے پاس بھی نہ تھی۔ لہٰذا فی الحال باوجود ہر طرح

ئی دماغی کاوش کے وہی مضمون رہا کہ ملاّ کی دوڑ مسجد تک ۔ یعنی عارضہ کو اپنا ہمدرد اور ہمراز بنا کر گھر لوٹ آؤں اور آخر ش پھر اسی خلجان میں پڑ جاؤں پھر اسی روحی اور دماغی تکلیف میں تڑپوں ۔ وہ روحی تکلیف جس کا اندازہ لگا نا معمولی کام نہیں ۔

# افشائے راز

عارفہ کے یہاں سے آئے ہوئے ہفتہ بھر گذر چکا تھا اور اس دوران میں یہ حال تھا کہ دم بہ دم الجھن بڑھ رہی تھی اور اس پر طرّہ یہ کہ میں نے ایک عجیب وغریب بات دریافت کی۔ ایک دم سے مجھے اماں جان کے ایک جملہ پر محسوس ہوا کہ اب سے نہیں بہت پہلے سے وہ میری حالت پر اچھی طرح غور کر رہی تھیں۔ ان کی تمام گذشتہ باتیں ایک ایک کر کے دل میں کھٹکنے لگیں اور ایک بات سے دوسری بات کی کڑی جو ملائی تو صاف نظر آیا کہ اب سے نہیں بہت پہلے سے وہ میری طرف سے مشکوک ہیں۔ اور پھر اس احساس کے پیدا ہوتے ہی میں نے اپنی حالت کو دیکھا، میری جسمانی حالت میں اس قسم کا تغیر ہو چکا تھا کہ میں اس کو اٹھتے بیٹھتے پوشیدہ

رکھنا چاہتی تھی۔ اب جو مجھے اماں جان کی طرف سے یہ احساس ہوا تو میں نے دیکھا کہ اٹھتے بیٹھتے ان کی نظر میرے اوپر ہے۔ وہ میرے حرکات و سکنات کو کس طرح دیکھتی ہیں! چنانچہ یہ ہوا کہ وہ مجھے انہی نظروں سے اپنی دانست میں چھُپ کر دیکھ رہی تھیں کہ گویا میں نے انھیں پکڑ لیا۔ میری اور ان کی آنکھیں چار ہوئیں اور ان کی اور میری دونوں کی حالت وہ ہوئی کہ جیسے میں چور تھی۔ اور انھوں نے پکڑ لیا۔ یا وہ چور تھیں اور میں نے پکڑ لیا۔ میرے ہاتھ میں ایک ڈبہ کا ڈھکنا تھا اور وقتی انتشار کے باعث وہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا انھوں نے میری حالت اور ابتری محسوس کی اور دوسری طرف منہ پھیر کے جماہی لی۔ اور میرا یہ حال کہ میں سیدھی کمرے میں مُنہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور بدن پسینے پسینے۔

---

مجھے کمرے میں آئے مشکل سے پانچ منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ دروازہ پر آہٹ ہوئی۔ گویا اعصاب میں درانتی سی چلتی معلوم دی۔ چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ مُنہ فق ہو گیا۔ حلق میں کانٹا پڑ گیا اور ایک ہی اضطرابی حالت ہو گئی۔ والدہ صاحبہ آ کر میرے پلنگ کے پاس جو بیٹھی ہیں تو مجھے معلوم ہو گیا

کہ اب راز ان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اصل معاملہ معلوم کرنے نہیں آئی ہیں بلکہ محض تصدیق کرنے آئی ہیں۔ یہ وقت میرے لئے کیسا سخت تھا۔ اس کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے۔

کچھ رازداری کا پہلو لئے ہوئے انھوں نے مجھے ٹھوکا دیا۔ اور اپنی دانست میں رویہ بدل کر پوچھا "یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

بس ان کا یہ کہنا تھا کہ میں بے قابو ہو گئی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا اُمنڈ آیا۔ وہ تو سب کچھ جانتی ہی تھیں، انھوں نے بیکل ہو کر جھپٹ کر مجھے سنبھالا۔ گلے سے لگا کر بڑی رازداری سے کہا "چپ۔ چُپ! خاموش" بس اتنا کہہ کر وہ تیزی سے چلی گئیں۔

اس کے آدھ گھنٹے بعد ہی ان کی منہ بولی بہن اور میری مُنہ بولی خالہ آئیں، وہ اماں جان کے پاس گئیں اور وہاں سے سیدھی میرے پاس آئیں اور انھوں نے آتے ہی مجھ سے یہ کہہ کر پوست کندہ حالات پوچھے کہ "بیٹی اب چھپانے کی بات نہیں اور نہ چُھپائی جا سکتی ہے۔"

میری حالت اور تکلیف کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ شرم بھی ایسی چیز ہے جس کی شدت سے موت کا سا پسینہ آجاتا ہے۔

قصہ مختصر جس طرح بھی بن پڑا اور رو رو کر منہ چھپا کر ٹکڑے کر کر کے میں نے حرف بحرف قصہ سُنا دیا بلکہ انھوں نے پوچھ لیا۔ اس کے بعد اچھی طرح مجھے دیکھا اور دلاسہ دیا۔ سمجھایا اور چمکارا مگر ساتھ ہی سرزنش کے لہجہ میں کس کر ایک جھڑکی بھی دی کہ آخر اتنے دن تک میں نے کیوں اس معاملہ کو پوشیدہ رکھا۔ میں بھلا اس کا کیا جواب دیتی۔ کیسے کہہ دیتی کہ اس امید پر خاموش رہی کہ سمجھی تھی کہ بات گئی گذری ہو گئی۔

میرے پاس سے اٹھ کر وہ گئیں اور والدہ صاحبہ کے رونے کی ایک دبی ہوئی چیخ نے مجھے مطلع کر دیا کہ انھوں نے پورا حال والدہ صاحبہ سے کہدیا لیکن وہ ایک اضطراری کیفیت تھی اور وہ فوراً چپ ہو گئیں۔ شاید اسی وجہ سے کہ فوراً کے فوراً بات کسے پتہ نہ لگ جائیں۔

ایک دم سے ایسا معلوم ہوا کہ ایک خاموشی چھا گئی۔ اور بات وہیں کی وہیں گھونٹ کر رکھدی گئی۔

والد صاحب سے بڑی دیر تک اماں جان نے باتیں کیں اور غیر معمولی طور پر اپنے کمرہ میں بند ہو کر رہ گئے۔

اس کے دوسرے ہی دن ایسا معلوم ہوا کہ معاملات نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ گھر کی رفتار گو وہی تھی۔ بات چیت بھی وہی تھی، اور ظاہرا وہی روزمرہ کا دستور العمل تھا، مگر ایک غمناک سکوت در و دیوار سے برس رہا تھا۔

اس کے بعد تکالیف نے پہلو بدلا۔ باوجود گھر کے صبر آزما تحمل کے گھر والوں کو وہ روحی تکلیف پہونچ رہی تھی جو شاید میری موت پر بھی نہ ہوتی۔ وہ تکلیف جو کسی عزیز کی موت سے زیادہ روح فرسا اور جاں گسل ہے۔ میں دیکھتی تھی کہ گھر والوں کو کسی پہلو قرار نہیں ہے۔ میں دیکھتی تھی کہ اٹھتے اور بیٹھتے مسلسل اور پیہم گھر والوں کے دلوں میں ایک دردناک اور خوفناک غم کی برچھیاں لگ رہی ہیں! قصہ مختصر روحی تکالیف کی انتہا میرے سامنے تھی۔ غم کے زہر آلود پنجے میں دیکھ رہی تھی کہ کس طرح گھر والوں کے دل و جگر میں اپنی تیز اور زہریلی نوکیں گاڑے ہوئے ہیں۔ اور آہنی اور بے رحم خوفناک غم کا پنجہ کس طرح دل و جگر میں گڑ کر ایسی پھریری لیتا ہے کہ تکلیف سے تڑپتے ہیں مگر تڑپنا ناممکن۔ روتے ہیں مگر رونا ناممکن۔

گھر کی مصیبت کی اگر ابتدا ہوئی تو میری مصیبت کا شباب! خدا کا قہر جیتی جاگتی صورت میں میری صورت پر پھٹ پڑا! بیشک میرے لئے یہ خدا کا قہر تھا۔ میں نے اپنے قابل احترام اور عزیز باپ کو کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ اُن کے نورانی چہرہ پر ایک اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اُداسی جو سال بھر ہوا منجھلے بھائی مرحوم کی جوان موت کے وقت بھی نہ تھی! یہ تو ایک خوفناک اُداسی تھی! میں نے خون کے آنسو اپنی آنکھوں سے بہاتے ہوئے اپنے پیارے باپ کی سچ مچ ٹوٹی ہوئی کمر کو دیکھا۔ جس پر گھر کے تفکّرات کا بار تھا۔ غضب ہے خدا کا کہ کڑیل جوان اور ہونہار بیٹے کی موت کا صدمہ کس جوانمردی سے اُنھوں نے جھیلا مگر اس غم نے تو سچ مچ ایک دن میں اُن کی کمر توڑ دی! میں نے دیکھا کہ برآمدہ میں کھڑے اماں جان سے باتیں چپکے چپکے کر رہی ہیں چہرہ پر غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ میرے دیکھتے دیکھتے، باتیں کرتے کرتے، اُن کے اُداس مگر نورانی چہرہ پر غمناک زلزلہ سا آیا۔ مضبوط اور قوی دل کی شریانیں ٹوٹتی معلوم دیں کہ چشم زدن میں برچھیاں مارتے مارتے غم کی عفریت نے ایک گرز گھما کر دیا۔ ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں اور میری دیکھتے دیکھتے چشم زدن میں اس خوفناک عفریت نے قوتِ مردانہ کو شکست دی

اور ضعیف آنکھوں نے ہار کر دریا چھوڑ دیا۔ اور مُرجھائے ہوئے چہرے پر سے ڈھلک ڈھلک کر آنسوؤں نے ڈاڑھی کو سیراب کرنا شروع کر دیا۔

والدہ صاحبہ کا بھی یہی حال ہوا ان کی نظر آہستہ سے اپنے غمناک شوہر کی طرف اُٹھی۔ نظر چار ہونا تھی کہ معلوم ہوا کہ مرد پھر مرد ہے۔ کس صفائی سے والد صاحب نے تیزی سے رومال سے اپنا مُنہ پونچھا۔ ایک آہ کھینچی۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ قوّت مردانہ کو یکجا کر کے اپنے جذبات کو کچل کر کہا "مجھے کچہری کو دیر ہو رہی ہے کھانا لاؤ"

غرض میں کیا عرض کروں کہ والد صاحب کی حالت کیا تھی اور کس طرح قابل رحم تھی۔ میں خود مصیبت میں تھی مگر بات در اصل یہ تھی کہ اُن کی مصیبت کا میں موجب تھی۔ اور میری مصیبت میں اُن کی مصیبت سے خار نکل آئے تھے۔ اُن کی عمر دیکھئے اور پھر یہ صدمہ! اُن کی صورت دیکھکر مجھے ترس آتا تھا اُن کے دل پر کیا گذرتی ہو گی! کیا سوچتے ہوں گے دل میں؟ یہ وہ سوالات تھے جو مجھے اَدھ مُوا کئے دے رہے تھے۔

---

اماں جان نے ہوشیاری یہ کی تھی کہ پہلے ہی دن مُلازمہ کو جواب

دیدیا تھا اور اب گھر میں سوائے گھر والوں کے کوئی نہ تھا۔ ورنہ بھانڈا پھوٹ چکا ہوتا۔

گھر کا گھر ایک درد کے عالم میں خاموش تھا۔ در و دیوار سے آہیں نکلتی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک منحوس اور خوفناک خاموشی گھر پہ طاری تھی۔ ہر چیز سے پریشانی اور عسرت اور ماندگی اس طرح ظاہر تھی کہ جیسے گھر پہ مصیبت نہیں بلکہ تباہی چھائی ہوئی ہے۔

پھر یہ سب کچھ درد و غم، رنج و محن، وقتی نہیں تھا! کسی عزیز کی جوان موت کی طرح! بلکہ پیہم اور مسلسل تھا جس کی انتہا نامعلوم!

ان تمام امور پر غور کیجئے کہ سوسائٹی کا یہ مجرم کس سرزنش کے لائق ہے۔

---

مگر یہ سب کچھ بھی اس خوفناک جرم کے نتائج کی ابتدا تھی، انتہا کس نے دیکھی تھی۔ ابھی تو بربادی اور نحوست کی طرف بڑھتا ہی قدم تھا۔ چنانچہ اگلا اسٹیج اس دردناک قصّہ کا یہ ہے کہ گھر کے بعد بازار پر نوبت آئی۔ یعنی یہ بات جو پوشیدہ رکھنے کی تھی اب گھر سے نکل کر محلّہ میں پہونچی۔ وہ

مضمون ہوا کہ "ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی"!

جس روز کہ خالہ بی صاجبہ سے میں نے سب کچھ اقبال کیا تھا اسی روز کا ذکر ہے کہ ایک نہایت ہی معتبر اور رازدار عورت مجھے دیکھنے کے لئے بلائی گئی تھی۔ اُس نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ اب اس راز کا پوشیدہ رہنا کسی صورت ممکن نہیں۔ نہایت ہی رازداری کی شرط پر اُسے بُلوایا گیا تھا۔ اور رازداری ہی کا اس نے وعدہ بھی کیا تھا۔ اس کے دوسرے ہی دن خالہ صاجبہ میری سسرال بھیج دی گئی تھیں تاکہ جلد سے جلد میری رخصتی کی فکر کریں۔ کیونکہ در اصل تجویز کچھ اور ہی ہو چکی تھی۔ یعنی اس جُرم کے سلسلہ میں اب خود ماں باپ ایک اور جُرم کرنے کا ھلاکت آفریں ارادہ کر چکے تھے۔ یہ تجویز تھی کہ کسی ہوشیار اور چابک دست قابلہ کی امداد سے مجھے سبکدوش کرا دیا جائے۔ اور اس کے بعد ہی جلد سے جلد شوہر کے گھر پہونچا دی جاؤں۔ مگر اس عورت نے اس سلسلہ میں مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور اب کسی دوسری عورت کی تلاش تھی۔ اور شاید اسی تلاش کے سلسلہ میں کسی نہ کسی طرح یہ بات پھوٹ نکلی اور گھر سے محلہ میں پہونچی۔ نتیجہ ظاہر۔

آنے جانیوالیوں اور پڑوس کی دوسری عورتوں کا کسی بہانہ سے گھر میں آنا اور دیکھنا کہ گھر کی ہوا ہی کچھ اور ہے ایک مُردنی ہے کہ چھائی ہوئی ہے مجھے دیکھنا کہ روپوش ہوں۔ میرے علیل ہونیکا عذر نہیں بلکہ عذرات۔ اور وہ بھی اس خوبصورتی سے کہ جیسا موقع دیکھا بات بنادی۔ کسی سے کچھ اور کسی سے کچھ۔ پھر دروغ گو را حافظہ نباشد!

پھر دیکھنے اور بھانپنے والیوں نے مجھے دیکھا بھی۔ اور نہ کیوں دیکھتیں اور پھر اُن دیکھنے اور بھانپنے والیوں میں کیسی کیسی "پَر دار" تھیں ایسی کہ لڑکی کے پیر کی آہٹ سے پتہ چلا لیں کہ کیا معاملہ ہے۔ ایک نظر میں تاڑ جائیں۔ قصّہ مختصر محلّہ والوں کو پتہ چل نہیں گیا بلکہ چل چکا تھا۔ کوئی مُنہ پر تو کہتی نہیں مگر اُڑتی اُڑاتی آخر سنی ہی گئی۔ والد صاحب کے ملنے والوں نے "غلط خبر" اڑانے والوں کی خود والد صاحب سے شکایت کی اور اس "دشمنی" کی وجہ پوچھی، نتیجہ ظاہر ہے، یعنی یہ کہ والد صاحب نے والدہ صاحبہ سے بہت جلد کہہ دیا کہ اب میں اس جگہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہا اور پھر بات پھوٹ چکی تھی۔ اور میری "فکر" بھی کرنا تھی، لہٰذا سوائے اس کے دوسری صورت ہی نظر نہ آئی کہ فوراً رخصت لے کر وطن چلیں۔ چنانچہ جس قدر جلد

بھی ممکن تھا رخصت حاصل کی اور یہ سوچ کر گھڑی ٹھانی کہ وہاں کسی کو معلوم ہی نہیں ہے۔ لہٰذا میری فکر بھی آسانی سے ممکن ہو گی۔ سب یہی سمجھیں گے کہ لڑکی کی شادی کرنے آئے ہیں۔ چنانچہ بغیر اس کا انتظار کئے ہوئے کہ خالہ بی صاحبہ نے میری رخصتی کے بارے میں کیا طے کیا ہے۔ جلد سے جلد ہم لوگ وطن پہونچے۔ اس قدر جلدی اور ایک دم سے ہم لوگ گئے ہیں کہ وطن پہونچ کر بھائی صاحب کو اطلاع کی گئی کہ ہم سب یہاں آ گئے ہیں، اُن غریب کو ان حالات کی کوئی خبر ہی نہ تھی۔

---

وطن پہونچنے کے چار روز بعد خالہ بی صاحبہ پہونچیں اور یہ خبر لائیں کہ میری سسرال والے ابھی رخصتی کے لئے تیار نہیں بلکہ تعجب کر رہے ہیں کہ جب ہماری طرف سے زور دیا گیا تھا تو مجبوری ظاہر کی گئی تھی، اور اب اتنی جلدی یہ کہتے ہو۔

ایک زوردار خط سسرال والوں کو اور لکھا گیا کہ جلد سے جلد مجھے رخصت کرا لے جائیں ورنہ پھر محض رخصتی کے لئے دوبارہ ہم لوگوں کو وطن آنا پڑے گا۔ اور اِدھر واقعی ایک ہوشیار عورت کو بُلا کر مجھے دکھا

با گیا۔ اور اس کے سپرد یہ کام ہوا کہ جلد سے جلد مجھے سبکدوش کرادی۔
اسے کافی روپیہ دیا گیا اور دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اس نے تیسرے روز
ہی کہہ دیا کہ بہترین وقت ضائع ہو چکا ہے۔ اور اگر ایسا گیا تو میری جان
کا خطرہ ہے۔ جس کی وہ قطعی ذمہ دار نہیں۔ مطلب یہ کہ جو روپیہ لے چکی
وہ ضبط اور کام ختم۔

مگر توبہ کیجئے۔ خدا کی پناہ! ذرا اس جرم کی خباثت اور شیطنت پر
غور کیجئے۔ وہی ماں باپ جنھوں نے مجھے پالا پوسا اور جوان کیا تھا۔ وہی
ماں باپ جو محبت میں میرے اوپر جان چھڑکتے تھے انھوں نے شاید آج
ہی کے دن کے لئے اور اسی لئے مجھے پروان چڑھایا تھا کہ ایک بدکردار
کے پنجے میں پھنس کر جب گھر کا نام ڈبونے لگوں تو اس کشتی کو گرداب سے
نکالنے کے لئے میری ہی جان کی قربانی کردی جائے۔

غرض کہہ دیا گیا اس عورت سے کہ کچھ پرواہ نہیں خواہ جان جائے
یا رہے تم علاج کرو۔ چنانچہ میں اب اس جان طلب مصیبت کے پیچ پیچ
مہلک مراحل طے کرنے کے لئے تیار تھی۔ آپ خیال کریں گے کہ یہ شاید
میری مصیبت کی انتہا تھی! توبہ کیجئے بھلا انتہا کس نے دیکھی تھی۔ مگر ذرا غور

غور تو کیجئے کہ یہ سب کچھ مصیبت میرے اوپر محض اس وجہ سے نازل ہوئی تھی کہ سماجی قوانین ہی کچھ ایسے ہیں۔ جب یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ ایک خاص قوم میں نیک چلنی یا بد چلنی کا معیار کیا ہے؟ جب کوئی دیکھنا چاہتا ہے کہ ایک خاص قوم کہاں تک من حیث القوم نیک چلن یا بد چلن ہے، تو بد قسمتی تو دیکھئے کہ فلاسفرانِ عالم نہیں تو کم از کم فلاسفرانِ ہند نے یہی طریقہ رکھا ہے، کہ انھیں اس سے بحث نہیں کہ معاملات کیا ہیں وہ تو صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں، اور دیکھتے ہیں، کہ اس قوم میں ظالم کے شکار، یعنی مظلومہ کے ساتھ کتنی سختی ہوتی ہے۔ اگر وہ دیکھتے ہیں کہ قوم ایک مظلومہ کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے اور اس کا برا حال ہوتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں، اور پکار کر کہتے ہیں کہ بے شک اس قوم کے افراد بے حد پاک باز ہیں۔ بے حد نیک چلن ہیں! نیک چلنی کا معیار بھی یہی ہے کہ مظلومہ پہ اس درجہ سختیاں روا رکھی جائیں کہ دوزخ کے عذابوں کی تمنا کرنے لگے۔ بالکل اسی طرح جیسے میں خود دوزخ کی تکالیف کو ان تکالیف سے بدرجہا بہتر اور عزیز سمجھتی تھی جو میرے اوپر گذر رہی تھیں۔

مگر اب تو نہ صرف ماں باپ راضی تھے بلکہ میں خود راضی تھی کہ ایک

جُرم کے پوشیدہ رکھنے کے لئے اب دوسرا جُرم کیا جائے۔ خواہ میری جان رہے یا جائے۔

# مُصیبت

ہمارا مکان اس طرح پر تھا کہ مکان در مکان تھا۔ ایک مردانہ مکان تھا اس کو پورا طے کر کے آؤ جب زنانہ مکان آتا تھا۔ اور یہ خوش قسمتی تھی کیونکہ آنے جانے والیوں کے لئے پوری زحمت ہوتی تھی اور کوئی عزیز رشتہ دار یا اور کوئی بیوی بغیر کافی نوٹس کے آ ہی نہیں سکتی تھیں۔ پھر ذرا سی ناقابل محسوس روک تھام سے ایسی ویسی آنے جانے والیوں کی بالکل ہی روک ہوگئی تھی۔ عزیز رشتہ داروں سے وہ لوگ عموماً نا آشنا ہی ہوتے ہیں جن کے والدین کی عُمر باہر ملازمت پر کٹتی ہے اور پھر میری شادی کا معاملہ درپیش تھا۔ لہٰذا کافی عذر تھا کہ کوئی بھی آئے (خواہ بہت ہی قریبی عزیز ہ) مگر میں ایک تاریک کمرے میں گھس جاؤں۔ اماں جان نے سکھا دیا تھا کہ ایسے

موقع پر ہیں لاکھ لاکھ ٹہوں مگر تو اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔ چنانچہ اگر قریبی رشتہ داروں میں سے کوئی بی بی آتیں تو یہی ہوتا اور اماں جان مجھے ڈانٹتیں جھڑکتیں، پھر خود ہی کہہ دیتیں کہ "اچھا ہے بوا! آج کل کی لڑکیوں میں شرم کی ضرورت بھی ہے" چنانچہ آنے والی بی بی زائد سے زائد یہی کرتیں کہ جب میں کسی طرح نہ نکلتی تو خود کمرہ میں گھس آتیں۔ اور میں اسی طرح بیٹھے بیٹھے ذرا منہ پھیر کر سلام کر لیتی اور وہ چلی جاتیں۔ چنانچہ اب اس طرح نہایت ہی اطمینان سے میرا خطرناک علاج ہو رہا تھا۔

ہفتہ بھر کے علاج ہی نے مجھے زیر و زبر کر دیا۔ میں صاحبِ فراش ہو گئی اور نوبت یہ اینجا رسید کہ معلوم ہوا کہ دنوں نہیں بلکہ شاید گھنٹوں کی مہمان ہوں۔ مگر سب بلیسود اور مجبوراً میری جان بچانے کے لئے خود معالج نے علاج کرنے سے ہاتھ روک لیا۔ ساتھ ساتھ اس علاج کے سسرال والوں پر بھی بے طرح زور ڈالا جا رہا تھا کہ جلد سے جلد رخصت کرا لیجائیں۔

اس دوران میں خط و کتابت کا یہ نتیجہ نکلا کہ میری سسرال والوں نے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی اور اِدھر چند روز بعد جب میں ٹھیک ہو گئی تو علاج شروع ہوا اور اس کی رفتار اس قدر امید افزا اور قابلِ

اطمینان بھی کہ معلوم ہوا کہ تمام مصیبتیں ختم ہوئیں ۔ مگر عین اس موقع پر جبکہ تمام تفکرات ختم ہوتی معلوم ہوئیں اور کامیابی کی صورت نظر آرہی تھی مصیبت نے بالکل نیا ہی پہلو بدلا ۔ مصیبت کیا آئی کہ ایک بلا آگئی ۔

بات در اصل یوں ہوئی کہ ہمارے دشمنوں نے نہیں ، بلکہ معالجہ کے دشمنوں نے ، ہمیں نہیں بلکہ خود اُسے نقصان پہنچانے کے لئے پولیس میں اس کی اطلاع کر دی ۔ پولیس نے دوڑ کر اس عورت کو پکڑا ۔ وہ اِسی جُرم میں دو دفعہ پیشتر کی سزا یافتہ تھی ۔ پولیس نے مار پیٹ کے اس سے اقبال کرا لیا اور والد صاحب کی تھانہ پر طلبی ہوئی ۔

والد صاحب کو یا ہم لوگوں کو شبہ بھی نہ ہوا کہ کیوں والد صاحب کی طلبی ہوئی ہے ۔ یہی سمجھے کہ کوئی محلہ کا معاملہ ہو گا ۔ وہ بے دھڑک نہایت ہی اطمینان سے چلے گئے مگر واپس جو آئے تو آتے ہی بیدم ہو کر دھم سے فرش پر گر پڑے ۔ اماں جان اور ہم سب یہی سمجھے کہ یوں ہی تکان یا اور اسی قسم کے سبب سے ایسا ہوا ہے ۔ مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے ۔ معلوم ہوتے ہی میرے تن بدن میں سناٹا آگیا ۔ پسینہ پسینہ ہو گئی ۔

اور سچ پچ ہوش نہ رہا ۔ نہ دیکھتی تھی اماں جان کا کیا حال ہے ۔
اب صورت حال یہ تھی کہ مقدمہ اٹھ کھڑا ہوا تھا ۔ عزت اور آبرو گئی اور اب معلوم ہوا کہ سب کچھ گیا ۔

بہت جلد معاملہ کی نزاکت اور واقعہ کی حقیقت کی مجھے تفصیل معلوم ہو گئی ۔ اب ایسے موقع پر ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کا کیا حال ہوا ہو گا ۔ سوائے اس کے کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی کہ روپیہ ، پیسہ اور ساز و سامان جہیز وغیرہ جو کچھ میرے لئے تیار تھا مقدمہ کی نذر کیا جائے اور جس طرح بن پڑے پولیس والوں کا پیٹ بھر کے اس معاملہ کو رفع دفع کیا جائے ۔ کسی نے کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی اور اب معلوم ہوا کہ اس کی جلو میں اور بھی بلائیں ہیں اور مفلسی بھی آکر سلام عرض کر رہی ہے ۔

---

دو دن وہ حیرانی اور پریشانی رہی ہے کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھلائے ۔ مگر شاید قسمت سیدھی تھی ۔ علاج وغیرہ تو میرا رخصت ہوا ۔ تھانہ کی دوا دوش میں خدا نے ایک صورت نکال دی ۔ تھانہ کے ایک منشی کے دل میں خدا معلوم کس طرح رحم آگیا ۔ والد صاحب اس کے ہاں رات کو گئے اپنی ساری

مصیبت اس کو سنائی ۔ شروع سے آخر تک ، اور اس سے کہا کہ خدا کے واسطے ہمارے اوپر رحم کرو ۔ خدا کو شاید خود رحم آگیا اور اس نے اس کا دل موم کر دیا ۔ اور وہ بھی ایسا کہ اُس نے پیسہ کوڑی کچھ نہ لیا اور پوری امداد کا وعدہ کیا ۔ مگر اس شرط پر کہ میرا علاج قطعی بند کر دیا جائے ، والد صاحب نے زور دیکر چاہا کہ یہ شرط ہٹالی جائے تو اس نے کہہ دیا کہ ذاتی طور پر اُسے کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر ایسا ہوا تو پھر خیر نہیں ہے ۔ دبا دبایا معاملہ حکام بالا کے پاس وہی شخص پہونچا دے گا جس نے یہ آگ لگائی تھی ۔ چنانچہ والد صاحب وعدہ کر کے اس منشی کو دُعائیں دیتے گھر آئے ۔ اور اس نے حسبِ وعدہ معاملہ کو نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ رفع دفع کر دیا ۔

اب یہ معاملہ تو رفع دفع ہو گیا ، لیکن مصیبت جوں کی توں رہی ، کہاں تو یہ امید تھی کہ اب تمام مصیبتیں ختم ہو جائیں گی ۔ اور اب علاج رُک گیا ۔ اور ادھر میری رخصتی کی تاریخ مقرر ہوئی اور والد صاحب کی ہمت نے اب سچ مچ جواب دے دیا ۔ انتہائی زور دے کر خود تاریخ مقرر کرائی تھی ۔ سو طرح کے بہانے کئے تھے ۔ معذوریاں ظاہر کی تھیں ۔ اور اب موجودہ صورت یہ تھی کہ رخصتی کی تاریخ موت کی تاریخ سے زیادہ

خوفناک تھی۔ اب پھر میری سسرال والوں کو تاریخ بدلنے کے لئے لکھنا ایک تماشہ تھا۔ خواہ مخواہ انھیں مشکوک کرنا نہیں بلکہ حقیقت سے آگاہ کرنے کے مترادف۔ کیونکہ ہر دم یہی خطرہ تھا کہ اُڑتی اُڑتی کہیں وہ لوگ سُن نہ لیں اور دھری رہ جائے سب رخصتی۔

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ والد صاحب ضرورت سے زیادہ پریشان ہو گئے۔ یہ حالت ہو گئی کہ اُن کی مطلقاً نیند اُڑ گئی۔ دو دن اور دو رات انھیں نیند نہ آئی۔ تیسرے دن اُن کی ہمت نے جواب دے دیا۔ وہ کر گذرے جو ہار کر آدمی کر گذرتا ہے۔

---

رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ اماں جان نے اٹھ کر سر پیٹ لیا۔ کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ والد صاحب نے زہر کھا لیا تھا! ملازمہ تو مصلحتاً کوئی ہمارے ہاں تھی نہیں۔ ایک چھوکرا تھا کام کے لئے۔ جس طرح بن پڑا ایک محلہ والے کو اُس سے بُلوا کر جلدی سے چچا صاحب کو خبر کرائی۔ ڈاکٹر کو بُلانا خالی از خطر نہ تھا، لہٰذا وہ جھپٹ کر اپنے ایک حکیم دوست کو لائے۔ انھوں نے افیون کا زہر تشخیص کیا۔ اور ویسے بھی معلوم تھا کہ افیون کھائی ہے کیونکہ شام

وہ اپنے خطرناک ارادے سے اماں جان کو مطلع کر چکے تھے اور جب انھوں نے خوشامد درامد کی تھی تو بمشکل جھوٹا وعدہ کر لیا تھا۔

جلدی جلدی علاج کی تدبیریں کی گئیں۔ تریاق دیئے گئے، اور قے کرائی گئی۔ خوش قسمتی کہئے جو وقت پر دوڑ دھوپ ہو گئی اور جو کچھ بھی زہر تھا وہ نکل گیا۔ دو دن اور دو رات حالت نہایت ہی نازک اور تشویشناک رہی۔ مگر تیسرے روز حالت ذرا درستی پر آئی اور حکیم صاحب نے اطمینان دلایا کہ خطرہ جاتا رہا۔ خدا خدا کر کے جان میں جان آئی۔

میرا اس موقع پر کیا حال ہو گا! ایک بات کو بار بار دُہرانا ہے بس خدا بہتر جانتا ہے۔ یا میرے اللہ! اب کیا ہو گا۔ اِدھر والد صاحب کا یہ حال، اُدھر میں جوں کی توں، اور میری رخصتی کی تاریخ سر پر! پانچویں دن اس واقعہ کے قرار پایا کہ والد صاحب کی بیماری کا عُذر کر کے تاریخ بڑھوائی جائے چنانچہ ایک تار دیا گیا۔

دوسرے روز تار کا جواب آیا۔ اُس میں لکھا تھا کہ اِدھر سے پوری تیاری ہو چکی ہے۔ اور والد صاحب کی شفایابی کے لئے دعائے خیر۔ اس کے بعد اُن لوگوں کا مفصل خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ تمام عزیزوں

کو مطلع کیا جا چکا ہے۔ اور دوسری تیاریاں ہو چکی ہیں اور اب تاریخ بڑھانا بالکل ناممکن ہے سوائے بحالتِ مجبوری۔ امید ظاہر کی گئی تھی کہ والد صاحب کی طبیعت جب تک درست ہو جائے گی اور اگر خدانخواستہ ایسی ہی طبیعت خراب ہوئی تو مجبوری ہے۔ ورنہ ایسی ویسی بیماری رخصتی میں حائل نہیں ہو سکتی۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ اگر اس موقع کو ٹال دیا گیا تو بات دُور جا پڑے گی جو انھیں کسی طرح منظور نہیں۔ قصہ مختصر ان کے عُذرات نہایت ہی معقول تھے۔ مگر ادھر سے ایک اور تار گیا، جس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا وہ سمجھتے کہ والد صاحب کی طبیعت اچھی ہو یا نہ ہو مگر تاریخ بڑھ جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے یہی معنی لئے اور جواب میں اپنی بات پر قائم رہے۔ یعنی یہ کہ اگر خدانخواستہ ایسی بیماری ہوئی کہ سچ مُچ رخصتی کرانا ناممکن ہے تو اس میں کہنے سُننے کی گنجائش ہی نہیں۔ دیکھا جائیگا۔ مگر ابھی سے بیماری کی "توقع" پر تاریخ ملتوی کرنا منظور نہیں۔

اب ایسی صورت میں سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ جلد سے جلد جس طرح ممکن ہو میرے علاج کی دوبارہ فکر کی جائے۔ چنانچہ یہ تجویز

پیش ہونا تھی کہ ساتھ ہی طے بھی ہو گئی۔ اور پھر اُسی جُرم کے ارتکاب کی تیاری تھی جس سے والد صاحب تائب ہو چکے تھے۔

آسمان پھٹ پڑے اُس پر۔ زمین کھا جائے اُسے۔ سانپ ڈس لے اس لڑکی کو جس کے باپ اور چچا پر قہرِ خدا اس صورت میں نازل ہو کہ وہ اس ناشاد اور نامُراد و ناکام لڑکی کے اس قسم کے علاج کے لئے غلطاں و پیچاں ہوں۔ دُنیا کا کوئی فردِ بشر اس قہرِ خداوندی کی قہاری۔ اور اس مصیبت کی دلآزاری کا اندازہ نہیں لگا سکتا تاوقتیکہ خدا خود اُسے روزِ بد نہ دکھائے۔ اور اس سے خدا دُشمن کو بھی محفوظ رکھے۔

حکیم صاحب چچا میاں کے بڑے گہرے دوست تھے اور اُن سے کوئی امر پوشیدہ نہ رہا۔ چنانچہ اب یہ قرار پایا کہ اِس معاملہ میں اُن سے امداد لی جائے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جس معاملہ کے بارے میں پولیس تک کو علم ہو چکا ہو، اور خدا خدا کر کے دب دبا گیا ہو، اُس میں کون ہاتھ ڈالے گا۔ پھر ویسے ہی کوئی سمجھدار آدمی کیوں اس میں پڑے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے ہمت کر کے نہ معلوم کس طرح حکیم صاحب سے جو درخواست

کی گئی تو انھوں نے گھبرا کر معذرت کی کہ میں نے نہ کبھی ایسا علاج کیا، اور نہ مجھے اس کا تجربہ، اور نہ میں کر سکتا ہوں، اور نہ مشورہ دے سکتا ہوں لیکن جب چچا صاحب نے اُن پر زور ڈالا۔ صورتِ حال سمجھائی۔ کہ کس طرح عزت و آبرو کا سوال درپیش ہے۔ تو وہ طوعاً و کرہاً راضی ہو گئے۔ لیکن جب انھوں نے صحیح علاج کرنے کی نیت سے مفصل حالات دریافت کئے۔ حساب لگایا اور دو مرتبہ کی ناکام کوششوں کی تفصیل سُنی اور پھر اس کے بعد اس علاج کرنے والی عورت کو بُلا کر پچھلے اور موجودہ حالات کی تفتیش کی اور اُن دواؤں کو معلوم کیا جو مجھے دی جا چکی ہیں۔ تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ موجودہ حالت میں ایسی کوشش کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہوئی، اور دوسری بات یہ کہ اگر کامیابی ہو گئی، اور میں جانبر ہو بھی گئی تب بھی ایک دوسرے خطرہ کا اندیشہ تھا۔ یعنی میرے دماغ ماؤف ہو جانے کا اور پھر یہ واقعہ تو تھا ہی کہ بیماری کے سلسلہ میں شاید چھ سات مہینے چارپائی گوڑنا پڑے۔

چنانچہ یہ باتیں سُنکر سب کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ مگر یہ وقتی اور عارضی بات تھی اور فوراً ہی یہ قرار پایا کہ باوجود ان تمام امور کے میرا

علاج کرایا جائیگا! خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اور اب تو تاریخ بڑھانے کیلئے لکھنا خود خطرناک قرار دیا گیا۔ یہ سوچا گیا کہ اس قسم کی قبل از وقت باتیں کر کے خواہ مخواہ ان لوگوں کو شبہ میں ڈالنا ہوگا۔ اور عجب نہیں اس تاریخ کی پلٹا پلٹی کی کوشش میں حقیقت آشکارا ہو جائے۔

اُدھر تو سب کا یہ خیال اور یہاں اب میری حالت بالکل مختلف تھی جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ اتنی کہ اس کا اندازہ لگانا اُس وقت تک واقعی دُشوار ہے جب تک یہ اندازہ ہو جائے کہ جان دینا کس قدر تکلیف دہ اور مشکل ہے۔ گذشتہ علاج کی تکالیف کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔ کس طرح موت کے منہ میں پہونچ چکی تھی۔ اور پھر اب حکیم صاحب نے اور بھی خطرہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ پھر یہ بھی مجھے قطعی یقین نہیں تھا کہ جان جوکھم میں ڈالنے سے معاملہ کا معاملہ ہی آیا گیا ہو جائیگا۔ کوئی سولہ آنہ اُمیّد نہ تھی، پھر ایسی صورت میں مجھے اگر علاج کرانے میں تامّل ہوا تو کون تعجب ہے۔ میں نے غور جو کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تمام باتیں محض عارضی کارروائی ہیں۔ میں اگر جاں بر بھی ہو گئی تب بھی ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی طرح، یہ معاملہ بے نقاب ہوگا اور پھر اور بھی مُصیبت آئیگی۔

مگر یہ تو سب بہانے تھے۔ اصل بات تو یہ تھی کہ میں محض امید موہوم پر
بھروسہ کر کے علاج میں پڑ کر موت کی تکالیف دوبارہ نہیں اٹھانا چاہتی تھی
واقعات نے شرم وحیا کے معاملہ میں مجھے سچ مچ چکنا گھڑا بنا دیا تھا اور میں نے
اور میں نے بھی بے حیائی لادلی اور دبی زبان سے والدہ صاحبہ سے علاج
کرانے سے انکار کر دیا۔

جیسا میں نے عرض کیا، میری شرم وحیا رخصت ہو ہی چکی تھی۔
بالخصوص والد صاحب کی علالت کی وجہ سے، کہ حیرانی اور پریشانی میں،
ان کی تیمارداری کرنے میں امّاں جان کا ہاتھ بٹانے والی میں بھی تھی۔
لہٰذا بر بنائے شرم ولحاظ میرا انکار کچھ بھی ہو، مگر پھر بھی میرے انکار پر
والد صاحب اور چچا صاحب وغیرہ نے اظہارِ تعجب ہی نہیں کیا، بلکہ ناراض
اور پریشان ہوئے۔ مگر میں ارادہ کر چکی تھی اور علاج کی خوفناک صعوبتوں
اور سختیوں کا بخوبی اندازہ اور تجربہ کر لینے کے بعد، ہرگز دوبارہ سامنا کرنیکو
تیار نہ تھی۔
میرے انکار کو گھر والوں نے تو سب نے ناپسند کیا، لیکن حکیم صاحب

نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ وہ بھی شاید اس وجہ سے کہ خود اُن کی جان چھوٹ گئی۔ کچھ بھی ہو انھوں نے میری تائید کی، بلکہ اور بھی تُوردا الفاظ میں کہہ دیا کہ علاج کرانا میری جان لینے کے برابر ہوگا۔

اب موجودہ صورت میں سوال یہ تھا کہ پھر کیا ہوگا؟ مجھ سے امّاں جان نے سر پیٹ کر پوچھا "کہ کمبخت ایسی جان پیاری ہوگئی کہ باپ دادا کی لاج کی فکر نہ رہی۔ مگر اب تُو یہ بتا کہ پھر کیا ہوگا؟"

میں نے اس کا یہ جواب دیا کہ جس طرح ممکن ہو سکے مجھے تم لوگ چُپ چُپاتے رخصت کر دو۔ میں وہاں جا کر بُھگت لوں گی جیسے بھی بنے گا۔ میرا کوئی قصور نہیں اور مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اب دراصل لاچاری اور مجبوری مجھے مجبور کر رہی تھی کہ اپنی بے گُناہی کی آڑ پکڑوں اور اس عُذر کے ساتھ میں اپنے میں ایک ناقابلِ بیان ہمّت محسوس کر رہی تھی مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سب کچھ جو میں نے کیا یہ میری کمزوری تھی۔ مجھے ذرّہ بھر ڈرنا یا جھجکنا نہیں چاہیئے۔ کس میں ہمّت ہے جو مجھے بُرا کہے۔ مجال نہیں جو مجھے کوئی خواہ مخواہ خوار کرے، اور کوئی ضرورت نہیں جو میں چوروں اور دغا بازوں کی طرح مُنہ چھپاتی پھروں۔ درحالیکہ میرا باطن صاف ہے

اور میں حقیقی معنی میں معصوم ہوں۔ خواہ شوہر کو میرے اوپر یقین آئے یا نہ آئے میں بیدھڑک اپنی معصومیّت اور بے گناہی کے برتے پر اس سے آنکھیں چار کرنے کو تیار رہوں۔ الغرض طبیعت نے ایکا ایکی عزم اور استقلال کے ساتھ ایسا پلٹا کھایا کہ مجھے تعجّب ہوا کہ اب تک میں خواہ مخواہ دُنیا سے کیوں مُنہ چھپاتی پھرتی تھی۔ کوئی ضرورت نہیں خواہ مخواہ زبردستی چور اور گنہگار بننے کی۔ چنانچہ میں نے بڑی تیزی اور کرختگی کے ساتھ والدہ صاحبہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ کوئی ضرورت نہیں جو میں علاج کراؤں تم مجھے رخصت کردو۔ میں جانوں اور میرا کام۔ اِدھر پھر حکیم صاحب نے جو میرا رویّہ معلوم کیا تو کہنے لگے کہ شوہر پھر شوہر ہوتا ہے۔ لڑکی کا اگر ایسا خیال ہے اور وہ واقعی اس معاملہ میں معصوم بھی ہے تو خدا اس کی مدد کرے گا۔

دو تین دن کی ردّ و قدح کے بعد جب سب نے دیکھا کہ میں اپنی ارادے پر سختی سے قائم ہوں تو کیا کرتے۔ مجبور ہو کر معاملہ کو تن بہ تقدیر کہہ کر چھوڑ دیا۔ اور اب میری باری آئی کہ اپنے عزم و استقلال سے اور اعلان معصومیّت سے، گھر والوں کی شکستہ ہمتوں میں جان

ڈال دوں ۔ پھر یہ بھی واقعہ تھا کہ باوجود اس گڑبڑ سٹ پٹ کے ، واقعہ کا علم نہایت ہی معتبر سینوں میں محفوظ تھا ، اور پوری توقع بھی کہ اسی طرح رخصتی بھی ہو جائیگی اور پھر اس کے بعد؟ دیکھا جائیگا ! میں خود بھگت لونگی۔

---

جب معاملات اس طرح طے ہونا قرار پائے تو والدہ صاحبہ نے جلد سے جلد مجھے مایوں بٹھا دیا یعنی اعلان کر دیا گیا کہ میں قطعی دولھن ہوں ، اور جیسی کچھ بھی تیاریاں ضروری تھیں گویا سب کچھ بھول کر اُن کی فکر میں لگنے کی کوشِش کی۔

میری طبیعت میں اب نہ تو وہ انتشار تھا اور نہ ہیجان تھا۔ بلکہ عزم و سکون تھا۔ مگر دن میں دو مرتبہ ضرور ہمت ٹوٹ جاتی تھی مصیبت اپنی خوفناک آنکھوں سے گھورنے لگتی تھی ۔ اور میں پھر اپنی ہمت کی برچھیوں سے اس ڈائن کی آنکھیں پھوڑ دیتی تھی ۔ مگر جوں جوں دن گذرنے لگے ہمت میں ایک ناقابل بیان کمزوری سرائت کرتی محسوس ہونے لگی۔ مگر پھر بھی تکلیف نہ تھی ۔ یا یوں کہئے کہ مصیبت کی تکلیف طبیعت پر ایک مُہلک مرض کی طرح ، اس طرح مسلط اور حاوی ہو کر رہ گئی تھی کہ مرض کی

اور لین درد کی بے چینی تو نہیں تھی، مگر ہاں موت کی آمد کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ جو آہستہ آہستہ اسٹیم رولر کی طرح، اپنے خوفناک وزن کے ساتھ میری طرف چڑھا چلا آ رہا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ اور ہفتے بھی کتنے! ایک ناقابل بیان سکون تو نہیں مگر سکوت کے ساتھ گذرتے گئے۔ ظاہراً تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہی سکوت اور سکون اخیر وقت تک رہے گا۔ اور قطعی نہ معلوم تھا کہ قریب قریب ہر سکوت کسی قیامت خیز تلاطم کا پیش خیمہ ہوتا ہے، اور وہ طوفان آنیوالا ہے جس کے بھنور میں پڑکر خاندانی عزت اور آبرو کی ناؤ غرقاب ہو کر رہ جائیگی مگر......

کسی کو یقین نہ تھا کہ چپ چپاتے میری رخصتی ہو جانے میں کوئی ایسا رخنہ پڑے گا۔ جو چشم زدن میں تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کو انتہا پر پہونچا دے گا، اور اس وقت مجھے معلوم ہو گا کہ جو کچھ بھی مصیبت گذر چکی تھی وہ اس کے آگے کچھ نہیں تھی اور اصل مصیبت اس کو کہتے ہیں۔

# انتہائے مصیبت

میں وہ وقت کبھی نہ بھولوں گی جب مہمانوں سے گھر بھر گیا اور مجھے سج دھج لباس عروسی پہنایا گیا۔ میری ہمت اور استقلال میں بگیناہی کی وجہ سے جو اعتمادِ راسخ پیدا ہوا تھا وہ وقت کے گذرنے کے ساتھ کمزور پڑتا چلا گیا تھا۔ مگر اس وقت تو اس نازیبا لباس کے پہنتے ہی جیسے طنابیں ڈھیلی ہوگئیں۔ محض اس احساس نے مجھے شل کر دیا کہ لفظ عروسی کا میرے اوپر اطلاق نہیں ہوتا۔ اور ایسا کرنا خود اس لفظ کی توہین ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک قابلِ نفریں دھوکا دہی ہے، اور عیاری اور چالبازی کی انتہا ہے جس کو بیگناہی اور معصومیت سے کوئی تعلق نہیں، ایک دوشیزہ اور کنواری دُولھن ہوتی ہے! اور ایک بیوہ دولھن ہوسکتی ہے،

ممکر میں کیسے دولھن بنائی یا کہلائی جا سکتی ہوں۔ مکاری یا عیّاری کی غیر موجودگی میں ہمت اور استقلال معصومیت اور بے گناہی کا سر بلند ہوتا ہے اور یہاں تو عیّاری اور مکّاری دولھن کے گھونگھٹ میں پوشیدہ کرکے پرورش کی جا رہی ہے۔ اور صاف ظاہر تھا کہ اس شانِ شاہانہ اور فرعودسانہ کے ساتھ بہت جلد ایک ٹریجک ڈرامہ کھیلا جائیگا۔ اور سارا راز طشت از بام ہو کر رہ جائیگا۔ اور یہ مکاری اور عیاری ڈی امناٹ کی طرح بھک سے اُڑ جائے گی۔

---

برات والے آئے اور بڑے ٹھاٹھ سے آئے۔ ہمارے مکان سے کافی فاصلے پر براتی ٹھہرائے گئے تھے۔ اُدھر سے بھی اپنے مقدور کے موافق پورا انتظام تھا۔ میرے اوپر وقت تو سخت گذر رہا تھا۔ مگر بالخصوص وہ وقت بہت سخت تھا جب سُنا کہ برات والے اب رخصت کرانے آیا ہی چاہتے ہیں۔

کس طرح دیدہ دلیری کی جا رہی ہے اس کا حشر کیا ہوگا؟ جب رخصت ہو کر وہاں پہونچوں گی اور یہ معاملہ بے نقاب ہوگا تب کیا ہوگا

غالباً وہ خود گھبرا کر اپنی عزت و آبرو کو بچانے کی خاطر فی الحال چُپ چُپاتے ہمجھے لے جائیں گے۔ مگر پھر؟ پھر دیکھا جائیگا! نہ معلوم کیا ہوگا؟

یہ سب کچھ جو گذر رہا تھا، وہ یا تو میرے دل میں گذر رہا تھا یا گھر والوں کے دل میں گذر رہا ہوگا۔ مگر فی الحال تو شادی کا ہنگامہ تھا کہ سوائے میرے گھر والوں کو سوچنے اور خیال کرنے کی مُہلت ہی نہ تھی۔ ہر شخص بڑی تندہی سے اپنے کام میں مشغول تھا اور مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ شادی نہیں بلکہ اعلیٰ پیمانہ پر ایک ناکام تمسخر ہو رہا ہے۔

برات کی آمد آمد کا غل ہوا، اور میرے دل میں موت کی سی ٹھنڈک بیٹھنا شروع ہوئی۔ جس وقت میری سسرال والیاں گھر میں اُتر رہی ہیں اس وقت میری تمام ہمّت تھک کر چور ہو گئی تھی، اور نیم بیہوشی کا سا عالم طاری تھا۔ والدہ صاحبہ نے ایسا سخت انتظام کیا تھا کہ سوائے کسی معتبر رازدار کے مجھ تک کسی کا گذر ہی ممکن نہ تھا۔ اور جو ممکن تھا وہ اس طرح کہ اصلیّت پردہ میں تھی۔ میری کمزوری رونا اور غش کھانا یہ سب باتیں میری انتہائی شرم پر محمول کی گئیں۔

میرے صدمے کو سراہا گیا کہ یہ وہی صدمہ ہے جو سچ مچ میں ہندوستانی دولھن کو گھر کی جدائی کی وجہ سے کچھ تو رسماً اور کچھ واقعی ہوا کرتا ہے۔

اب اس کا اگلا اسٹیج یہ ہے کہ خوفناک رسموں کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ رسمیں خوف ناک تھیں۔ کیونکہ سچ مچ اب ہر راز دار کی انتہائی قابلیت اور مکاری کا سخت امتحان تھا۔ ایک ذرا سی لغزش، ایک ذرا سی لاپرواہی سے سب کچھ قبل از وقت معلوم ہو جانے کا خوفناک اندیشہ تھا۔

---

دُولھا ایک ایسی شے ہے کہ اس کے آنے کی خبر اندر اور باہر سب جگہ پھیل جاتی ہے۔ بارات کے ساتھ خوش قسمت دولھا میاں بھی بجائے گھوڑے کے ایک موٹر میں تشریف لائے اور یہ خبر میرے کانوں تک بھی پہونچی۔ کیونکہ دولھا کے آتے ہی گھر بھر میں زلزلہ آگیا۔ نہ صرف دولھا کی آمد بلکہ اس کا حلیہ تک اس طرح پکار پکار کر بیان کیا گیا کہ ہر کس و ناکس سُن لے۔

میں نے اپنے شوہر کا نہ صرف حلیہ معلوم کر لیا، بلکہ اس قدر مفصّل

حال سُنا کہ جیسے میرے سامنے آموجود ہوا۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں نے اچھل اُچھل کر۔ اور بڑھیوں نے اپنے حلق پھاڑ پھاڑ کر دُولہا کے مردانہ حُسن کے بارے میں تعریفی جملے میرے کانوں میں پہونچائے۔ کوئی تو دولہا کے قدو قامت کا ذکر اس خوبی سے کرتی تھی کہ تمام لسّانی ختم، اور کوئی تھی کہ جامہ زیبی کی داد دیتی تھی۔ کسی کی زبان پر دولہا کے رنگ و روپ کا ذکر تھا تو کسی کو دولہا کا بانکپن پسند تھا۔ کسی نے دُولھا کو شرمیلا بتایا تو کسی اور نے اُسے بھولا بنایا۔ پھر موازنہ کر کے چند "کٹنیوں" نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ دولہا چند اور کالے پیلے اور کانے کھتر ے دولھاؤں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ اور اس سلسلہ میں قریب ڈیڑھ درجن اور دُولھاؤں کے پیچ مچ زبانی کارٹون پیش کر دیئے گئے۔ اور دو چار کو کلموہے کا خطاب بخشدیا گیا۔

قصّہ مختصر یہ تمام باتیں میرے کانوں تک بھی پہونچیں، اور مجھے معلوم ہوا کہ میرا عزیز شوہر ہمہ صفت موصوف ہے۔ اس میں تمام باتیں موجود ہیں جن کی بنار پر ایک دُولھن اپنے کو خوش قسمت خیال کر سکتی ہے اور یہ بات میرے لئے اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ میرے دل پر وہ چھوٹ

لگی کہ تحریر میں لانا ناممکن ہے، میرے دل سے آہیں نہیں بلکہ دھواں نکل رہا تھا۔ آنسو نہیں بلکہ جیتا جیتا خون نکل رہا تھا۔

---

رسمیں ہونے ہی والی تھیں اور میں اس امتحان کے لئے اپنی تمام منتشر قوتوں کو اکٹھا کر رہی تھیں کہ یونہی سننے میں آیا کہ دولہا میاں اپنے کسی دوست کے یہاں ایک دو منٹ کے لئے تشریف لے گئے تھے اور دیر ہوئی مگر ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ چنانچہ ان کا سخت انتظار کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ اِدھر اُدھر کے ایک آدھ فقرے سے میں نے بھی اندازہ لگایا۔ پھر تقاضہ پہ تقاضہ اندر سے گیا۔ میری خوشدامن اور دوسری سسرال والی دو چار عورتیں مجھے سخت بے چینی اور تکلیف میں مبتلا کر کے یعنی میرے پاس آ کر اور دو چار رسموں کی حماقت آمیز تمہید اُٹھا کر اٹھ بھی چکی تھیں۔ اور اب ہر کس و ناکس کی زبان پر یہی تھا کہ دولہا کہاں گیا!

دولہا کی غیر حاضری خود دولہا والیوں اور باہر دولہا والوں کیلئے باعث تشویش تو کیا ہوتی مگر ہاں بزرگوں کی ناراضی کا باعث ضرور

ہوئی۔ والد تو تھے نہیں دولھا کے۔ چچا اور ماموں وغیرہ یا اسی قسم کے بزرگ لوگ البتّہ تھے اور اندر خبریں پہونچ رہی تھیں کہ دولھا کی رویّہ سے یہ لوگ دولھا پر کس قدر گرم ہو رہے ہیں کہ ذرا خیال نہیں اس کو کہ ایسے موقع پر اٹھ کر بغیر پوچھے گچھے سب کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر چل دیا۔ کسی نے روکا بھی نہیں نہ معلوم کیا سمجھے۔

یہ تو دولھا والوں کا حال تھا مگر اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کے دل میں چور تھا۔ یعنی ہم لوگ۔ میں خود یہ خبر سنتے ہی ٹھنڈی پڑ گئی کہ کسی عورت نے کہا کہ یہاں کا تھانیدار دولھا کا دوست ہے۔ اور اسی کے ساتھ گئے ہیں۔ کیا پولیس کے ذریعہ راز افشا ہو گیا ہے یہ سوال میرے دل میں تو آیا ہی تھا جو میں مُردہ سی ہو گئی۔ مگر والدہ صاحبہ وغیرہ کا بھی یہی حال ہوا۔ چنانچہ بدقسمتی سے یہ اندیشہ صحیح نکلا۔ یعنی یہ کہ دوست پھر دوست ہے۔ ہر دوست کا فرض ہے کہ ایسے موقع پر اپنے دوست دولھا کو آگاہ کر دے کہ دیکھو بھیّا یہ معاملہ ہے۔ چنانچہ اس موقع پر دوست نے ضرورت سے زیادہ سوچ بچار کیا۔ بتاؤں کہ نہ بتاؤں؟ ایک طرف ایک غریب خاندان کی عزّت و

آبرو جانے کا خیال، یعنی ہم لوگوں کا، اور دوسری طرف اپنی دوست دولھا کا خیال۔ چنانچہ اس ششں و پنج سے دولھا کے دوست نے عین موقع پر اس طرح رہائی حاصل کی کہ برات سے اٹھا کر تھانہ پر سے جا کر میرے والے دبے دباتے مقدمہ کی مسل میرے شوہر کے سامنے کھول کر رکھدی کہ سچ اور جھوٹ کا غذات ہیں سے تم بین لو۔ معاملہ یہ ہے! اور اب تم جانو اور تمہارا کام۔

دُولھا بھی آخر پولیس کا آدمی ٹھہرا۔ اُس نے عورت کو طلب کر کے معاملہ پوچھا اور یہ کارروائی ہو رہی تھی کہ یہاں سے دُولھا صاحب کی چچا پہونچے تھانہ میں۔ آگ بگولا بن کر کہ وہ سخت نالائق دوست ہے جس کی دوستی نے وہ مضمون کر دیا کہ "برات سے دُولھا غائب"۔

اب آپ ہی اندازہ لگا لیجئے کہ میرے خوش قسمت شوہر کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اِدھر سے دولھا صاحب کے چچا جو خفا ہوتے ہوئے اُن کے پاس پہونچے تو انھوں نے اس عورت کی طرف اشارہ کر کے مسل مقدمہ اُن کے آگے ڈال دی کہ خفا بعد میں ہو جیئے گا۔ پہلے اس مسل کے اندراجات کی اس عورت سے تصدیق تو کر لیجئے اور ساتھ ہی

واپس جانے سے انکار کر دیا۔

قصہ بہت طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ جب چچا بھی وہیں کے ہو رہے تو دو تین اور گئے۔ یہاں گھر میں یہ عجیب و غریب خبر معمّہ ہو کر رہ گئی کہ چچا گئے وہ غائب ہو گئے اور اب سچ مچ حالات تشویش ناک معلوم دیئے۔ لیکن اور لوگ جو گئے تھے وہ بھی وہیں کے ہو رہے۔ دو تین اور گئے اور نتیجہ پھر اس کا یہ نکلا کہ دولھا کے چچا وغیرہ تھانہ سے واپس آئے۔ اور پھر جو انھوں نے اپنی عورتوں سے باتیں کی ہیں تو اللہ دے اور بندہ لے۔ یعنی معاملہ طشت از بام ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

دفعتہً گھر میں ایک کھلبلی مچ گئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ایک سے ایک پوچھ رہی تھی اور یہاں جیسے ہم سب پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

میرے تن بدن سے روح پرواز کرتی معلوم ہوئی۔ ٹھنڈک کا سناٹا ایک خوف ناک اور روح فرسا گُدگُدی کے ساتھ جان میں تیرتا معلوم ہوا۔ ہاتھ پاؤں کھنچنے لگے۔ حلق میں کانٹا پڑ گیا۔ آنکھوں تلے جھپکیاں سی آئیں۔ اور اندھیرا معلوم ہونے لگا۔ سر چکرایا اور کمرہ جو گھوما تو میں نے زور سے چارپائی پکڑ لی۔ . . . . پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا

. . . میں غش کی حالت میں تھی۔

میں تو اِدھر غش میں پڑی تھی، اور اُدھر معاملہ نے ہنگامی صورت اختیار کی۔ کچھ دیر تو برات والیوں میں سازشیں ہوئیں، بلوائیوں کی طرح سمٹ کر ایک جگہ ہوگئیں اور پھر انھوں نے محسوس کیا کہ ہم پر بھی کوئی فرض عائد ہوا ہے۔ ایک بڑی بی اس حلقہ جمہوریت سے برات والیوں کی نمایندہ بن کر اماں جان کو کونے میں لے گئیں اور اُن سے طوطے کی سی آنکھیں نکال کر کہا "بہن! یہ کیا معاملہ ہے؟ کچھ دال میں کالا ہے۔ صاف صاف بتاؤ نہیں تو مجھے دُلھن کو اچھی طرح دکھاؤ۔"

اب اماں جان کے عقل و ہوش ویسے بھی رخصت ہو چکے تھے، لہٰذا بجائے انھوں نے کچھ اور کہنے کے غلطی تو دیکھئے، بڑی بی کو کچھ آڑے ہاتھوں لیا اور کہدیا کہ دولھن نہیں دکھائی جا سکتی۔ یہ نہ سمجھیں کہ اوّل تو واقعہ اور پھر اس کی تصدیق سب کچھ ہو چکی صرف اقبال کی کسر ہے۔

جب بڑی بی نے دولھن نہ دکھانے کی وجہ پوچھی تو کیا عمدہ جواب

ملا۔ کہہ دیا کہ دولھن گھر چھوٹنے کے صدمے سے بے ہوش ہے، بڑی بی بولیں کہ میں بے ہوشی ہی میں دیکھ لوں گی تو اس کا یہ جواب دیا کہ کوئی ضرورت نہیں گھر جا کر دیکھنا۔ چنانچہ اس گفتگو کا جو نتیجہ نکل سکتا تھا وہی نکلا۔ اُدھر سے اس امر پر زور دیا گیا اور اِدھر سے انکار کیا گیا۔ قصہ مختصراً اس خوب صورتی سے بھانڈا پھوٹا، وہ بات جو ہونا تھی اس طرح سے ہوئی۔

پھر لطف یہ لطف ملاحظہ ہو کہ اندر تو انکار تھا اور باہر جو اس معاملہ کو اٹھایا گیا تو نہایت ہی معصومیت سے لاعلمی اور تعجب کا اظہار کیا گیا۔ اور وہ بھی ایسا کہ بعد میں یہ تمام باتیں مبدّل بہ خاموشی ہوگئیں۔ یوں کہیئے کہ اقرار کرلیا گیا۔

اب اس قصّہ کے اٹھنے کے بعد براتیوں کے سامنے بھی ایک الجھا ہوا معاملہ پیش ہو گیا۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ بعض کا خیال تھا کہ فوراً چل دینا چاہیئے واپس۔ کسی کی رائے میں ایسا کرنا دولھا والوں کی بدنامی کا باعث تھا۔ اور کسی کی رائے میں دُولھا اور دولھا والونکی توہین ہوچکی تھی اور معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ دُولھا غریب کیا کرتا۔ سوائے

اس کے کہ اس نے مجھے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور سچ بھی ہے جیسی مکھی کسی نے نگلی جاتی ہے۔ کوئی بھی ہوتا وہی کرتا جو میرے شوہر نے کیا۔

شادی بیاہ کا معاملہ تھا۔ قانون داں اور مولوی سب ہی لوگ جمع تھے۔ مولویوں نے بتایا کہ نکاح جوں کا توں ہے اور اگر طلاق دو تو بیس ہزار کا مہر واجب ہو گا۔ اور یہ پوائنٹ ایسا تھا کہ معاملات پر دولھا والوں کو بجائے جلد بازی سے کام لینے کے غور کرنا پڑا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اب بھی معاملہ خاص خاص تک محدود تھا۔ اور بہت جلد مشاورت کر کے بارات والے ایک نتیجہ پر تو پہونچ گئے۔ اور وہ یہ کہ ڈولھن کو ہم ہرگز نہ لے جائیں گے، اب دوسرا معاملہ زیر غور ہو یا نہ ہو سب برابر تھا۔ کم از کم میرے لئے۔ اور اب اس دوران میں ہماری یہاں والوں کو معصوم لاعلمی ایک خاموش اقبال میں تبدیل ہو کر ان ارتقائی مراحل کو طے کر کے اس حد کو پہونچی کہ نہ معلوم ادھر سے بھی وعدے لئے گئے تھے یا نہیں۔ مگر اُدھر سے ضرور وعدے کئے گئے کہ ضرور بالضرور اس معاملہ پہ غور کریں گے۔ گویا یہ معاملہ طے ہو گیا کہ مجھے نہیں لیجائیں

گئے۔

چنانچہ سارے براتی جیسے آئے تھے ویسے واپس چلے گئے اور وہی ہوا جس کے ہونیکی اُمید تھی۔ اور جو ہونا چاہیئے تھا۔

---

یہ سب کچھ گذرتا گیا اور شکر ہے کہ میں نے براتیوں کی واپسی کا سین نہیں دیکھا۔ میرے اوپر غشی کا اس قدر زبردست حملہ ہوا تھا کہ دو گھنٹہ کی خبر لائی۔ حکیم صاحب بُلائے گئے۔ لخلخا سنگھایا۔ دوائیں دی گئیں جب جا کر ہوش آیا۔ جب مجھے ہوش آیا اور ٹھیک ہوئی ہوں تو باوجود مہمانوں کے ایک عجیب وغریب ماتمی سکوت گھر پر مسلط تھا۔ کوئی نہیں رو رہا تھا اور سب رو رہی تھیں۔ مگر شاید بڑے سکون اور سکوت کے ساتھ، یعنی چپکے چپکے اور آہستہ آہستہ۔ میرے لئے ایک موت کا عالم پیشِ نظر تھا۔ میں خاموش حُجلہ عروسی میں لباسِ فاخرہ زیبِ تن کئے ہوئے اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں خود جنازہ ہوں اور یہ تمام مہمان، شادی میں نہیں بلکہ ماتم پُرسی میں آئے ہوئے ہیں۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر میں خود بے حس و حرکت تھی۔ صدمہ کا بوجھ

کمر توڑ چکا تھا، بس اشکوں کی جھڑی لگی تھی جو کسی طرح تھمنے میں نہ آتی تھی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھوں ہی کے راستہ سے نہایت ہی خاموشی اور سکون کے ساتھ سارا خون آنسو بن کر بہہ جائیگا۔ چنانچہ بے ہوشی رفع ہونے کے بعد تازہ ترین اطلاع میرے لئے یہی تھی کہ برات واپس چلی گئی۔

اب میں صدمات اور تکلیف سے اس درجہ کچل کر رہ گئی تھی کہ روح تک معطل ہوئی تھی۔ میرے لئے یہ سوچنا کہ باہر والد صاحب کا کیا حال ہوگا چچا صاحب پر کیسی گذر رہی ہوگی۔ بس یہ خیالات تھے اور فوارے کی طرح آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ رہا تھا۔ دل ایک سناٹے میں آکر حلق میں چڑھتا معلوم ہوتا تھا اور رونے کا...... خاموش رونے کا دورے پہ دورہ ایسا پڑھتا تھا کہ رہ رہ کر اور اُمنڈ اُمنڈ کر رونے کا زور ہوتا تھا۔ تیزی بڑھنی جاتی تھی، زور بڑھتا جاتا تھا، اور انتہا پر پہونچکر میں شل ہوجاتی۔ رگ رگ سے جان تحلیل ہوتی معلوم ہوتی۔ تھک کر چوُر ہوجاتی۔ تن بدن ٹھنڈا پڑ جاتا۔ ایک ہلکی سی سردی محسوس ہوتی۔ ہچکیاں بند ہوجاتیں۔ دم گھٹ کر رہ جاتا۔ اور سارا جسم بے قابو ہوکر، ایک

نیم بے ہوشی کا عالم طاری ہو کر رہ جاتا۔ اور یہ وقفہ ہوتا تھا تاکہ میں پھر رونے کے لئے تازہ دم ہو جاؤں۔ تکیہ اور ہاتھ اور رومال سب کے سب تر بتر تھے۔ کٹورے کے کٹورے اور گلاس کے گلاس آنسوؤں کے تھے کہ نکل چکے تھے اور نکل رہے تھے۔

---

گھر میں سوائے رونے دھونے کے اور کچھ نہ کھتا تھا۔ مگر باہر کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔ چچا صاحب جن کو کہ میری معصومیت کا سب سے زیادہ صحیح اندازہ تھا ایک دم سے تڑپ کر اُٹھے۔ بے دھڑک اور بے جھجک میری معصومیت کے برتے پر وہاں پہونچے۔ اور خواہش ظاہر کی کہ دولھا سے تخلیہ میں باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں لوگوں نے اعتراض ٹھونک دیا کہ ملنا تو ہو سکتا ہے لیکن تخلیہ میں نہیں۔ لیکن تھوڑی سے اصرار کے بعد طے پایا کہ کوئی حرج نہیں اور باتیں کرلیں۔

چنانچہ چچا صاحب نے اُن سے کیا باتیں کیں؟ کچھ پتہ نہیں۔ مگر وہ بھی بے نیل و مرام واپس آئے۔ لیکن ساتھ ہی بہت عمدہ خیالات لے کر آئے۔ وہ محسوس کر کے آئے کہ ہم لوگوں سے کم

انھیں صدمہ نہیں پہونچا ہے۔ اور یہ کہ جوش انتقام کے جذبہ سے وہ بے قابو ہیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے قسمیں کھائی ہیں کہ جب تک دشمن سے بدلہ نہ لے لیں گے انھیں چین نہ پڑے گا۔ پھر یہ کہ ہماری بے عزّتی نہیں بلکہ خود اُن کی بھی بےعزّتی ہوئی ہے۔

اماں جان نے جب چچا صاحب کی زبانی یہ سب تعریفیں سُنیں تو وہ بے قرار ہوگئیں۔ دہاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ داماد کے حق میں اُن کے سچّے مگر ٹوٹے ہوئے دل سے کیسی کیسی دعائیں نکلی ہیں کہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ اگر یہ دعا قبول نہ ہوئی تو پھر کون سی دعا قبول ہوگی۔ اور پھر اِن دعاؤں کے بعد جو انھوں نے بلک بلک کر اس ظالم کو کوسا ہے تو سننے والیاں لرز لرز گئیں۔ انھوں نے ہانپ ہانپ کر اور ہل ہل کر کوسا کہ "الٰہی جس نے میرے اوپر یہ قہر ڈھایا اس کے اوپر تو بھی قہر توڑ یو...... جیسا اس نے مجھے ذلیل و رسوا کیا۔ خدایا اس سے سوا تو اسے ذلیل کر...... خدایا جس طرح میری بیٹی کی جوانی کا اس نے ستیاناس کیا ویسے ہی اس کی بھی اٹھتی جوانی پر بجلی گرے"....

وغیرہ وغیرہ۔

قصہ مختصر جس طرح انھوں نے بلک بلک کر کوسا ہے کہ شاید مظلوم کی دُکھیاری ماں کے علاوہ کوئی دوسرا کوس ہی نہیں سکتا! مجھے خود کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ دعائیں اور بد دعائیں خالی نہیں جائینگی بس یہی معلوم ہوا کہ ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن۔ اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

ان کوسنوں کو سُن کر میرے ہاتھ میں بھی حربہ آگیا اور میں نے بھی یہی دعا مانگی کہ "الٰہی جس نے مجھے خانماں برباد کیا خدا کرے اس کی بیوی کے سامنے بھی ایسا ہی آئے .......... خدا کرے کوئی اس کی بیوی کو بھی اسی طرح بے عزت اور برباد کرے ...... جس طرح اس ظالم نے مجھے بے آبرو کیا"

میں کوس رہی تھی اور صدمے کے ساتھ ساتھ غصہ کے دھوئیں میں سر پٹخ پٹخ کر اپنی بیکسی پر روتی اور تڑپتی تھی اور وہ "گٹ گٹ" کر کوستی تھی کہ خدا کی پناہ۔ رہ رہ کر میں سوچتی تھی کہ افسوس صد افسوس۔ جب وقت ظالم چلنے لگا ہے چاقو تو سامنے ہی پڑا تھا۔ آخر کیوں نہ میں نے جھپٹ کر پیچھے سے بھونک دیا! باوجود اپنی تمام قدرتی

کمزوری کے ہیں نے محسوس کیا کہ میں اس موذی کو مار ڈالنے کیلئے تنہا کافی تھی۔ اور اب میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیسے اس نے میرے اوپر غلبہ پالیا۔ مجھے مکر سے کام لے کر اس کا وہیں خاتمہ کر دینا چاہئے تھا۔

رہ رہ کر میں اس ظالم کو کوستی اور دانت پیس پیس کر رہ جاتی اور سر پٹکتی۔ ہاتھوں میں بے بس ہو کر کاٹتی اور اُلجھن میں پٹی پر مارتی اور اپنا سر دھنتی اور پھر خوب روتی اور خوب روتی۔ حتیٰ کہ شل ہو کر اور پست ہو کر رہ جاتی۔

دن ختم ہونے آیا اور ایک ایک کر کے مہمان جلدی جلدی اس ماتم کدہ کی حیرانی اور پریشانی سے نجات حاصل کر کے رخصت ہوئے۔ رات آئی مگر رات کے دس بجے تک ہماری طرف سے گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر بدقسمتی سے نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بلکہ تلخیاں پیدا ہو گئیں۔ کچھ چبھتے ہوئے جملے اُدھر والوں نے کہے تو اِدھر والوں نے بھی جلے کٹے جواب دیئے۔ نتیجہ یہ کہ گرما گرمی تک نوبت پہونچی۔ اور یہ بات اب طے تھی کہ برات والے کل شام کی گاڑی سے خالی خولی جیسے

آئے تھے واپس جا رہے تھے۔

یہ تھا وہ فیصلہ جو تقدیر نے میرے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ رات اپنا تمام اندھیرا لے کر آئی۔ اور ہمارے گھر یعنی ماتم کدہ پر سیاہی اور تاریکی کا خوفناک پردہ ڈال دیا۔ یہ ہیبت ناک اور عجیب و غریب رات مجھکو عمر بھر یاد رہے گی۔ رات گئے تک میں رویا کی۔ پچھلے پہر یعنی بارہ بجے کے بعد میں سو گئی اور میں نے ایک نہایت ہی خوف ناک! نہایت ہی بھیانک اور جاں گسل اور عجیب و غریب خواب دیکھا۔

# تیسرا حصّہ

# شعرانیة

# ویمپائر

"....... کیا دیکھتی ہوں کہ سارے گھر میں ایک روشنی اور اُجالے کی کایا پھیلی ہوئی ہے کہ نور کی چاندنی نے کھیت کیا ہے۔ خوشبوؤں سے نہیں بلکہ محبّت کی پریوں کی گرم گرم اور میٹھی میٹھی سانسوں سے میرا حجلۂ عروسی مہک رہا ہے۔ ....... اک شورِ مسلسل کا تخیل گویا کانوں میں گونج رہا ہے ....... یا برات کی گڑبڑ! ....... میں کسی کا سختی سے انتظار کر رہی ہوں!

خاموشی میں آنے جانے والیوں اور مہمانوں کی چہل پہل! .... .... اُن کے چلنے پھرنے کی آہٹ! اُن کے زرق برق کپڑوں کی سرسراہٹ ...... ایک ناقابلِ بیان اور ناقابلِ سماعت کہربائی

متوج بن کر طبیعت میں محسوس ہو رہی ہے......گویا بیاں تاریکی
کے منحوس سایہ کی طرح اِدھر سے اُدھر جا رہی ہیں!........میری
گردن جھکی ہوئی ہے۔ کپڑوں میں اچھی طرح لپٹی ہوئی دولھن بنی بیٹھی
ہوں۔ سوائے میرے دل کی دھڑکن کے شاید کائنات ہی ایک سکوت
اور جمود کے عالم میں مدہوش ہے!........لیکن اس جمود و سکوت
کی "لہروں" میں باہر کے براتیوں کی چہل پہل سے مدّ و جزر سا پیدا ہو رہا
ہے۔........قصہ مختصر برات اور شادی کی گہما گھمی اور غل غپاڑہ
کا ایک "خاموش تخیل" میرے سامنے ہے اور میں ہوں!
ایک دم سے اس عالمِ سکوت میں ایک لرزش سی پیدا ہوتی ہے
......دروازہ نہایت ہی آہستگی سے اپنی چول پر گردش کرتا ہے
ایک عطر کا بھبکا سا آتا ہے......تازہ اور شگفتہ پھولوں کی مہک!
......مجھے معلوم ہے کون آیا!.......میرا دل ایک عجیب و غریب
ناقابلِ بیان مسرت سے گھبرا جاتا ہے!
اس کے بعد ہی میں اپنے بائیں بازو پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کرتی ہوں
کسی نے مجھے کھڑا کیا۔ میں ساتھ چلی!.....میں کپڑوں میں لپٹی ہوئی ہوں

اور کچھ دیکھ نہیں سکتی، مگر خواب میں تو گویا خود ٹھوا پنے شوہر کے ساتھ رخصت ہوتے خود ہی دیکھ رہی ہوں۔ میرے قدم بڑی ہوشیاری سے اٹھ رہے ہیں۔

ابھی کمرے سے باہر بھی نہیں پہونچی کہ میرے بدن کو خفیف سا جھٹکا سا لگتا ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ جست کر کے میرے شوہر نے مجھ سے علیحدگی اختیار کر لی اور کہا "ہیں! یہ دھوکا!" اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ سکوں دیکھتی ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر چل دیئے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ شادی کے زریں کپڑے پہن رہے ہیں۔ مگر میری طرف اُن کی پُشت ہے۔ بنارسی اچکن جو ہمارے یہاں سے بن کر گئی تھی اس کے بڑے بڑے سُنہرے پھول دھوپ چھاؤں میں چمک رہے ہیں جس کی تیزی میری آنکھوں میں گھسی جا رہی ہے۔

اس طرح جاتا دیکھ کر دفعتہً میں بیقرار ہو کر دوڑتی ہوں اور تعاقب کرتی ہوں۔ کمرہ سے نکل کر نہ معلوم کس طرح اور کہاں پہونچی۔ وہ آگے اور میں پیچھے۔ لحاظ کے مارے پکارنا ناممکن ہے۔ لہٰذا ابڑی تیزی سے تعاقب میں چلی جا رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ معلوم کدھر اور کہاں چلی جا رہی

ہوں! بلکہ پہونچ گئی!

ایک لق ودق میدان ہے! چاروں طرف ہُو کا عالم ہے۔ جنگل بیابان کفِ دست میدان ہے!........ آدم نہ آدم زاد...... اس میدان میں ایک خیال آسا ہلکا سا غبار مُسلّط ہو گیا۔........ ایک دُھواں سا فضا میں تیر رہا ہے! بلکہ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دُھواں یا غبار نہیں ہے بلکہ ساری کائنات ایک ردائے غم اوڑھے.... عُسرت اور پریشانی کی روحوں سے معمور ہے!........ چاروں طرف ایک خاموش نحوست سی برس رہی ہے!...... ہیبت سی چھائی ہوئی ہے ........ خوف سا طاری ہے!....... میرا دل گرد وپیش کی سماں سے سہم گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ اس دوران میں بھی برابر میں اپنے شوہر کے تعاقب میں تھی۔ اور اب دیکھ رہی تھی کہ اِن کی رفتار میں فرق پڑ گیا........ میں نے قدم بڑھائے اور قریب پہونچی.... اور قریب ........ اور قریب پہونچی.... حتیٰ کہ ریشمی اچکن کے پھول مجھے صاف نظر آنے لگے۔........ میں اور قریب پہونچی اور ایک ناقابلِ بیان کشش مجھے اس طرف کھینچ رہی تھی۔

میں قریب پہونچ ہی گئی تھی اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک دم سے رُکی اور رُک کر جو میری طرف مُڑ کر دیکھا ہے۔

میرے مُنہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی! مارے دہشت اور لرزہ کے وہیں کی وہیں ٹھٹک کر رہ گئی۔ کیونکہ شوہر نہیں یہ تو ایک بھیانک اور خوف ناک بلا تھی جسے دیکھتے ہی مارے خوف و ہراس کے میرا خون جم گیا۔ میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور میں نے دیکھا کہ میرے سامنے ایک نہایت ہی بھیانک، اور نہایت ہی خوف ناک، اور نہایت ہی کریہہ المنظر شخص...... نہیں بلکہ بلا کھڑی تھی!

سیاہ تاب چہرہ!...... اس کی زرد رُو آنکھیں! نہایت ہی بڑا اور سخت گھناونا مُنہ تھا۔ جس پر ایک خوف ناک اور زہریلی مگر ساتھ ہی تمسخر آمیز مُسکراہٹ تھی۔ کہ تن بدن میرا کانپ اٹھا!

اس قدر غلیظ، اور ڈراونا، اور منحوس، اور قابلِ نفرت، اور مکروہ چہرہ، نہ میں نے کبھی دیکھا تھا، اور نہ خدا کبھی دکھلائے۔ خباثت اور گندگی چہرہ سے کس طرح عیاں تھی! اور مجھے دیکھ کر اس خوفناک چہرہ پر ایک مُسکراہٹ آئی...... چہرہ اور بھی خبیث اور مکروہ ہوگیا

........ مُسکراہٹ مبتدل بہ خندہ ہوئی اور میں نے دیکھا کہ میلے میلے اور نہایت ہی گندے دانت اور مسوڑے ہیں کہ جی متلا جائے۔ اور پھر ساتھ ہی عفونت آمیز اور غلیظ سانس کا بھبکا سا مجھ تک پہونچا۔

مارے دہشت اور انتہائی منافرت کے میں دو قدم پیچھے ہٹی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے خوف پر مُنافرت غالب آئی۔ ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ اُدھر اُس ناپاک چہرہ پر ایک نہایت ہی کمینی لرزش عیاں ہوئی موٹے موٹے ہونٹ جو منہ کی گندگی میں آلودہ تھے حرکت میں آئے ..

........ ہنسی نہیں تھی یہ ا بلکہ ایک پھنکار تھی اور ساتھ ہی میری طرف ایک نہایت ہی لمبا اور مکروہ ہاتھ بڑھا! ........ ہاتھ؟ نہیں بلکہ ایک مکروہ پنجہ تھا۔ ........ میلا........ گندگی اور نجاست سے بھرا ہوا........ بڑے بڑے ناخن تھے اور پنجہ کی ساخت مُرغی کی پیروں کی سی تھی........ میں اور پیچھے ہٹی تو اس بلا نے میری طرف سے مُنہ موڑ لیا اور آگے بڑھی۔ میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اس بلا نے دو قدم جو چل کر پھر مجھے مُڑ کر دیکھا تو تعجب کے مارے میرے مُنہ سے پھر چیخ نکلی ہوتی کیونکہ بجائے اس خوفناک چہرہ کے میں نے

دیکھا کہ یہ تو وہی ظالم ہے جس نے میری مٹی خراب کی تھی! مگر اس نے منہ موڑ لیا تھا۔

میں کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ پھر اس نے مُڑ کر دیکھا اور اب میں نے دیکھا کہ یہ تو وہی بلا ہے! قصہ مختصر میں کھڑی ہوئی تھی اور یہ جانے والی بلا مجھے مُڑ مُڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ ایک دفعہ اسی ظالم کا چہرہ ہو جاتا تھا۔ اور دوسری دفعہ پھر دیکھو تو وہی بلا!.......... باری باری سے دونوں کے دونوں قابلِ نفرت چہرے مجھے مُڑ مُڑ کر دیکھتے تھے!.......... زیادہ تیزی سے مُڑ مُڑ کر دیکھنا شروع کیا!.... اور تیزی سے!.. .... اور بھی تیزی سے! حتیٰ کہ یہ معلوم ہوا کہ کوئی مشین کام کر رہی ہے کہ دونوں چہرے باری باری سے دکھائی دے رہے ہیں!

چشم زدن میں...... دیکھتے ہی دیکھتے، دونوں چہرے اتنی تیزی سے، باری باری سے مُڑ مُڑ کر مجھے دیکھنے لگے، کہ میں نے محسوس کیا کہ جیسے ایک "ریل" پر دونوں چہرے چڑھا دیئے گئے ہیں اور میری آنکھوں میں دوڑ رہے ہیں!........ متحرک!........ متزلزل ........ لرزاں!........ دونوں منحوس چہرے میری آنکھوں میں

نہایت ہی سُرعت سے باری باری جھپکیاں سی دیتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ ...... دور ہوگئے ...... اور دور پہونچے ...... مگر اسی طرح متزلزل اور متحرک! ...... یعنی باری باری سے سُرعت کے ساتھ جھپکیاں سی دیتے ہوئے بہت دور پہونچ گئے ...... اور دور ...... اور بھی دور ...... بہت ہی دور ......

پھر اتنی دور پہونچے کہ ان کی بار بار کی حرکت کا محض شائبہ سا آنکھوں میں رہ گیا اور مادّی صورت گویا آنکھوں سے اُوجھل ہوگئی! ...... مگر دونوں چہروں کا تخیل اب بھی ان کی حرکت کے شائبہ کے ساتھ ساتھ نظروں کے سامنے تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد یہ شائبہ سا ایک متحرک و متزلزل سیاہ پٹھر سا معلوم دیا۔ جو چاندماری کی "گل زری" کی طرح افق کے پاس اب بھی وہی دونوں شکلیں پیش کرتا معلوم ہو رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ سیاہی کا نقطہ سا ہوکر رہ گیا۔ اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے رُک گیا! ...... کچھ منجمد سا ہوگیا ...... اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ اس نقطہ کی سیاہی تیز پڑ گئی ...... تیز ہوئی! ...... اور تیز ہوئی! ...... اور بھی تیز

ہو گئی...... حتیٰ کہ تیز تر ہو کر یہ نقطہ ایک سیاہ اور منحوس تارے کی طرح اُفق کے صاف و شفاف آسمان کو اپنی پُشت پر لئے ہوئے اس طرح چمکا کہ معلوم ہوا کہ مجھے گھور رہا ہے!

میں نے اور بھی غور سے دیکھا، اور اس کی سیاہی اور بھی تیز معلوم ہوئی، حتیٰ کہ مجھے یقین کامل ہو گیا کہ یہ منحوس اور سیاہ آنکھ مجھے سچ مُچ گھور رہی ہے۔

---

میں ٹکٹکی باندھے اس منحوس اور سیاہ تارے کو دیکھ رہی تھی۔ اور وہ میری آنکھوں میں گھُسا جا رہا تھا! میں نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ اور چپکے چپکے! یہ منحوس تارہ آسمان پر طلوع ہو رہا ہے!.... ایک منظم اور منحوس مگر تکلیف دہ رفتار سے اس نے طلوع ہونا شروع کیا! سیاہی اس کی بڑھتی جا رہی تھی! جسامت میں بتدریج فرق ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آسمان کی نورانی فضا میں تیرتا ہوا چلا آ رہا تھا!.. ... میرے دیکھتے دیکھتے جسامت اور بڑھ گئی حتیٰ کہ معلوم ہوا کہ چودھویں رات کا ایک سیاہ اور بھیانک چاند ہے جو چڑھتا چلا آ رہا ہے! حتیٰ کہ

میرے دیکھتے دیکھتے وہ بالکل ایک سیاہ اور خوف ناک چاند کی طرح اپنی بھیانک اور منحوس سیاہی لئے میرے سامنے آکر طلوع ہو کر رہ گیا!

اس کی سیاہی سے تاریک شعاعیں سی نکلتی معلوم دیں اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سیاہی بالکل چاندنی کی طرح چھٹکی ہوئی ہے. ایک نہایت ہی منحوس سایہ سا چاروں طرف اُتر رہا تھا! اور ناقابلِ بیان اور خاموش سیاہی سے ساری فضا مکدّر معلوم ہو رہی تھی! سچ مچ میں نحوست برستے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی!

میں اس عجیب و غریب اور ہیبت ناک منظر کو دیکھ رہی تھی کہ یہ سیاہی اور تاریکی کا چاند ایک دم سے لرزا! لرز کر کروٹ لی اور بارود کا سا ایک دھماکا ہوا کہ دیکھنے میں تو ضرور آیا مگر آواز ندارد۔ اور ایک سیاہی کا شرارہ کہئے، کہ اس تاریک چاند میں سے ایک تڑپ کے ساتھ نکلا! ...... ایسا معلوم دیا کہ آنکھوں میں سیاہی کا ایک بھالا لگا! ... بس سیاہی کی چمک اور تیزی سے آنکھیں جھپک گئیں کہ سیاہی کے شرارے کے ساتھ کچھ خون کی آمیزش لئے ایک دھواں دیتی ہوئی گیند کی طرح کی کوئی چیز گولے کی طرح نکلی اور عین میرے سر پر سے ہوتی ہوئی: ..... ایک

سیاہی کی گہری سی لکیر چھوڑتی ہوئی سیدھی اتنی دور چلی گئی کہ میں نے مُڑ کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بس چلی جا رہی ہے! ...... بالآخر زمین پر گرتی ہوئی معلوم دی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اور اب میرے سر پر ایک نہایت ہی سیاہ اور گہری لکیر تھی جو دم بدم تحلیل ہو رہی تھی اور اسی کو میں غور سے دیکھ رہی تھی۔

میں اس لکیر کو غور سے دیکھ رہی تھی جو سُرعت کے ساتھ تحلیل ہو رہی تھی کہ میری پُشت کی طرف سے، فاصلہ سے، ایک درد میں ڈوبی ہوئی نہیں بلکہ سراپا درد! نہایت ہی دردناک کراہنے کی ایسی آواز آئی کہ آری کی طرح میری جان کو چیرتی چلی گئی! ...... میرے رُونگٹے کھڑے ہو گئے! ...."آآآآ.....آ....ہ.....!"..... یہ کراہنے کی ایک دردناک اور رقّت آمیز آواز تھی جو اس قدر پُرہول اور رقّت آمیز تھی، کہ ایسا معلوم دیتا تھا کہ کسی غم کی ستائی عورت کو کوئی ظالم سچ مچ سخت ترین ایذا دے رہا ہے!

پھر وہی درد میں بھیگی اور لرزتی کانپتی آواز اٹھی! ......."آآ آآ....آآ......ہ!" اور پھر میرے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

..... مارے خوف کے کوئی چیز رگوں میں رینگتی معلوم دی۔ اور دل ہل گیا! لہجہ اور آواز سے صاف معلوم ہو گیا کہ بے شک یہ کسی بیکس اور مظلوم عورت کی دردناک آواز ہے! نہایت ہی غمگین! نہایت ہی دردناک، اور عجیب رقّت آمیز لہجہ تھا اور پھر آواز آئی "آ آ آ..... آ.....ہ!" اور اس دفعہ ایسا معلوم دیا کہ کسی نے سچ مچ درد کی پردی کو چھیڑ دیا ہے..... کہ آواز کانوں کو نہیں بلکہ درحقیقت دل و جان کو تڑپاتی چلی جا رہی ہے! ایک درد کا نکلا تھا کہ چھیدتا ہوا دل کو نکل گیا اس دفعہ یہ دردناک آواز غم کے سُروں میں کچھ اس طرح ڈوبی ہوئی اور ایک اندوہ گیں ترنم سے اس قدر معمور تھی کہ ایسا معلوم ہوا کہ رنج و غم، اور درد و کرب کو تار تار کر کے فضا میں چھوڑ گئی! اور پھر صاف معلوم ہوتا تھا کہ ہر دفعہ آواز قریب تر ہوتی جا رہی ہے!

میں آوازوں کو گن رہی تھی اور گیارھویں یا بارھویں آواز نہ صرف رقّت آمیز اور دردناک تھی بلکہ یہ معلوم ہوا کہ ایک مسلسل اور بھیانک راگ ہے جس نے ساری فضا کو مغموم اور درد انگیز نغموں سے معمور کر دیا۔ اور ان نغموں کی صدائے بازگشت کے زیر و بم سے فضائے

عالم خود ایک رقت آمیز اور دردناک طلاطم میں ہے۔ اور پھر یہ آواز اس قدر قریب تھی کہ میں حقیقتاً اوچھل پڑی۔ چنانچہ اب نہایت ہی غور سے میں نے اپنی آنکھوں کو مل کر اس سیاہ چاندنی کی تاریک اور مکدر "روشنی" میں اس طرف دیکھا کہ اتنے میں پھر آواز آئی ...... اور اس کے ساتھ ہی کچھ فاصلے پر کچھ متحرک چیز سی نظر آئی! میں نے اور بھی غور سے اور آنکھیں پھاڑ کر پھر دیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی عورت ہے جو انتہائی تکلیف اور کرب و بے چینی کی حالت میں جاں بلب ہے۔ ایک اور آواز آئی اور میں اس طرف کو بڑھی۔

---

میں غور سے دیکھ رہی تھی!

دھیمی دھیمی، سیاہ اور منحوس روشنی کو چیر کر میری نظر پہونچی۔ اور میں نے دیکھا کہ کچھ متحرک ہیولا سا ہے۔ میں تیزی سے قریب پہونچی اور اب میں نے دیکھا! ...... یا میرے اللہ! ...... میں نے جو کچھ دیکھا نہ تو وہ تحریر میں آسکتا ہے اور نہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ میں نے کیا دیکھا! میں نے انتہائی خوف اور تعجب سے مدہوش ہو کر دیکھا کہ ایک

ایک نہایت ہی خوب صورت دوشیزہ ہے اور اس کے بائیں طرف گلے میں ایک خونخوار آدمی جونک کی طرح چمٹا ہوا ہے...... آدمی ہے کہ بلا!...... اپنے خونخوار جبڑوں سے اس کی گردن دبائے...... دانت گڑائے ہوئے خون چوس رہا ہے! اور خون بہہ بہہ کر اس کے خوف ناک اور گھناؤنے جبڑوں اور دانتوں کو سُرخ کرتا ہوا نیچے آرہا ہے اور اس خون آشام بلا کے تنفس سے بہتے ہوئے خون میں سرسراہٹ سی ہو رہی ہے، جب وہ اپنا خوف ناک مُنہ گڑا کر اور اپنے خونی دانتوں سے گردن چبا کر خون پینے کے لئے چسکی لگاتا ہے، تو یہ خوبصورت لڑکی درد کی وجہ سے بیتاب ہو کر ایک "ہائے" یا "آہ" کی دردناک صدا لگاتی ہے جو اس لق و دق میدان میں چاروں طرف ایک دردناک سنسنی کے ساتھ تاریکی میں ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ اور فضا میں اپنی صدائے بازگشت کی مغموم آوازیں چھوڑتی ہوئی گُم ہو جاتی ہے مگر یہ خونی بلا کون تھی؟ وہی کریہہ المنظر بلا جو چہرے بدلتی بل کھاتی مجھے اسی میدان میں تماشے دکھلاتی آنکھ سے اوجھل ہو گئی تھی۔

میرے دیکھتے دیکھتے اس حسین و خوب صورت لڑکی نے درد کی

انتہائی تکلیف سے اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے مچھلی کی طرح بیتاب ہوکر ایک کروٹ لی۔ اس کا چہرہ انتہائی تکلیف کے صدمہ کی وجہ سے سفید ہوگیا۔ پیشانی پر درد کی وجہ سے بل پڑ گئے۔ مگر اس خون آشام بلانے اپنے مضبوط جبڑے سے اس کو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا اور زور دیکر سر اونچا کر کے قابو میں جو کرنا چاہا تو اس غریب کی نازک اور خوبصورت گردن کی چمڑی تک اُدھیڑ گئی۔ اور اس خون آشام بلانے ایک ہلکی سی غرّاہٹ کیساتھ اس کی نازک اور خوب صورت گردن کو بھنبوڑ ڈالا اور اپنی گرفت مضبوط کر کے اس زور سے ایک چُسکی لی ہے کہ گردن کے زخم سے خون اُبل کر شراٹے بھرتا گھونٹ کے گھونٹ اس خون آشام کے ہونٹوں اور دانتوں پر سے بہتا ہوا اس کے حلق میں پہونچا۔ اور اس حرکت کیساتھ ہی میں ایک اور حقیقت کو دیکھکر ایک دم سے چونک پڑی۔ ..... کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ ایک چہرہ تو خون آشامی میں مشغول تھا اور اس کی گدّی پر سانپ کے سے بالوں سے ڈھکا ہوا ایک اور بھی چہرہ تھا اور یہ چہرہ اسی ظالم کا تھا جس نے میری مٹی پلید کی تھی! ...... کس طرح اب یہ قابل نفرت اور منحوس چہرہ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف

دیکھ رہا تھا!!

نفرت! ایک انتہائی نفرت میرے دل میں اس وقت بجائے خوف کے موجود تھی۔ دو چہرے تھے اور میرے لئے دونوں کے دونوں یکساں قابل نفرت تھے!

"اے میرے خدا کیا مظلوموں کی کوئی شنوائی نہیں؟"۔۔۔۔
یہ الفاظ بہ مشکل میری زبان سے نکلے تھے کہ میری آنکھیں ایک نور کی خیرہ کُن روشنی کی لپک سے چوندھیا گئیں اور ساتھ ہی آسمان پر بجلی کا ایک کڑاکا سا ہوا۔۔۔۔۔۔میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔۔۔ہیں!۔۔۔۔
وہی بنارسی اچکن جو ہمارے یہاں سے تیار ہو کر دولہا کے یعنی میرے شوہر کے جوڑے کے لئے گئی تھی۔۔۔۔۔وہی شیروانی پہنے فضائے نورانی میں کسی کو میں نے دیکھا! چہرہ دیکھنے کے لئے میں بیتاب ہو گئی، مگر اول تو وہ سہرے کے پھولوں میں چھپا ہوا تھا اور پھر رُخ دوسری سمت تھا۔ یہ کون تھا؟ یہ پوچھنا فضول ہے۔ ایک نور کے بادل پر میں نے انھیں سنبھلتے دیکھا۔ نورانی دھواں پیچ در پیچ ان کے گرد گھوم رہا تھا۔۔۔۔۔۔تیر و کمان ان کے ہاتھ میں تھی اور میں نے دیکھا کہ اس سیاہ چاند

کی طرف کمان میں تیر جوڑ کر انھوں نے سر کر دیا۔

---

موت کا پیام بر!...... تیر ایک شعلہ کی طرح سنناتا ہوا سیدھا اس تاریک چاند کے بیچوں بیچ میں، گویا سیاہی کے قلب میں، ایک خونی جھپٹ کے ساتھ ترازو ہو گیا!...... گویا تودۂ بارود میں دہکتی ہوئی خون کی بوند پڑ گئی اور وہ بھک سے اُڑ گیا! ایک خاموش دھماکا سا ہوا اور نور کا تیغہ سیاہی کو کاٹتا ہوا چلا گیا! فضائے نورانی سے ایک عالم منور ہو کر رہ گیا اور میں نے دیکھا کہ ایک نورانی لکۂ ابر یا آب رواں کی چادر سی آسمان سے چرخ کھا کر میرے بالکل ہی قریب آ کر اُتری۔ میں دیکھتے ہی ششدر رہ گئی۔ صاف وشفاف پانی کی لہروں پر شعاعیں کانپتی ہیں یا سفید مخمل کو دھوپ چاٹتی ہے۔ وہ حالت اس آب رواں کے ریشمی پردے کی تھی کیونکہ اس کے اندر پیچ در پیچ تبسّم کی بجلیاں بند تھیں۔

میں اس کے بالکل ہی قریب پہونچی اور میں نے پردہ کا دامن جو اٹھایا تو کیا دیکھتی ہوں کہ بنارسی اچکن پہنے اور پھولوں کے سہرے سے

منہ چھپائے ہوئے وہی تیر انداز ہے۔" میں تیری مشکل حل کروں گا" پھولوں میں سے آواز آئی۔ اور میں نے خوشی میں گھبرا کر صورت شکل کو غور ہی جو آگے جھک کر دیکھا تو بجائے اس کے کہ کچھ صاف دکھائی دیتا کچھ دُھندلا سا ہیولا سا ہو کر رہ گیا۔ میں نے اور سر جھکا کر بہت غور سے جو دیکھا تو بجائے کسی اور چیز کے اپنی خود کی شکل نظر آئی! نہایت ہی خوب صورت، نہایت شاداں اور ذرا جو اپنی خوبصورتی کو غور سے دیکھنے کے لئے سر جو اور آگے بڑھایا تو ایک تڑاقا ہوا! .....

ہیں!

نہ وہ طلسم تھا! نہ وہ میدان اور نہ وہ تیر انداز اور نہ وہ آبِ رواں کا پردہ! میں تھی اور میرا کمرہ! اور کھڑی میز کے پاس اپنے بڑے آئینہ میں خود اپنی صورت کو دیکھ رہی تھی! .........

شیشے کا بڑا اگل دان ضرورت سے زیادہ آئینہ میں سر اڑانے سے کہنی لگ کر فرش پر تڑاقے کے ساتھ گر اٹھا!

میں نے اپنی مسکراتی اور متبسم شکل کو آئینہ میں ہوش میں آتی ہی دیکھا اور حقیقت معلوم کر کے میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں نے

اپنا بستر لپیٹ لیا! قصہ مختصر آنکھ جو کھلی تو کچھ نہ تھا۔ ہاں سویرا تھا!

صبح تھی.........میں تھی اور وہی ماتم کدہ ہمارا گھر.....

نئی صبح.....شاید وہی کل کی غمناک پریشانیاں اور حیرانیاں

ازسرِ نو دوہرانے آئی تھی.........آہ! وہی میں تھی اور وہی

مجھے چھوڑ جانے والی برات کے تکلیف دہ قصے!.........کیونکہ

براتی وغیرہ مجھے لے جانے سے تو انکار کر ہی چکے تھے اور آج جانے

والے تھے۔

یہ تھا وہ عجیب و غریب اور تکلیف دہ خواب جس نے میری

تکلیفوں میں اور بھی زیادتی کر دی! رہ رہ کر میں خواب کے خوفناک

اور عجیب و غریب حصوں پر غور کرتی تھی اور طرح طرح سے اس کی

دل ہی دل میں تعبیریں کرتی تھی "میں تیری مشکل حل کروں گا" یہ

جملہ کس قدر اُمید افزا تھا! کیا واقعی مجھے معاف نہ کر دیں گے؟ ضرور

یہ خواب سچا ہے اور اس کی یہی تعبیر ہے۔ ضرور بالضرور مجھے معاف

کر دیں گے اور مجھے ساتھ رخصت کر لے جائیں گے۔ چنانچہ کبھی تو یہ

خیال طبیعت کو گدگداتا اور کبھی حقیقت اپنی تمام واقعاتی عریانی کے ساتھ ایک قہقہہ لگاتی کہ تیرے خواب اور اس کی تعبیر یہ ہے کہ تو بدنامی کا پوٹ ہے۔ اور تجھے کوئی نہیں معاف کریگا اور کوئی نہ لے جائیگا۔ مگر پھر خواب کے الفاظ "میں تیری مشکل حل کروں گا" دل میں جم کر رہ جاتے کہ ضرور میری مشکل حل ہو جائے گی۔ اور اماں جان کو ایک سر توڑ کوشش تو کم از کم اور کرنا چاہیئے۔ ہمارے یہاں سے لوگوں کو آج وہاں جا کر انتہائی کوشش کرنا چاہیئے۔ ضرور بالضرور وہ غور کریں گے۔ کہ میری کوئی خطا نہیں اور قاعدہ سے جب میں اب بھی بیاہتا بیوی ہوں تو میری بے عزتی خود ان کی بے عزتی ہے اور میری عزت ان کی عزت ہے اور انھیں ضرور اپنی عزت بچانی چاہیئے اور مجھے لے جانا چاہیئے۔ چنانچہ میں سوچ رہی تھی کہ اماں جان سے کہوں مگر اُن کو مجھ سے پہلے سے خیال تھا چنانچہ انھوں نے چچا صاحب سے کہا کہ وہ یہ کہہ کر انھیں بلا لائیں کہ وومنٹ کے لئے تم سے بات کرنیکو خود تمھاری ساس بلاتی ہیں۔

میں خوش تھی کہ ضرور میرا خواب سچا ہے اور اس کی تعبیر بھی

نکلے گی کہ وہ مجھے معاف کردیں گے۔ مگر قسمت تو ملاحظہ ہو کہ ہر امکانی کوشش کی گئی مگر وہاں رحم وکرم ندارد اور خواب کی تعبیر ہی الٹی نکلی۔

# الٹی تعبیر

چچا صاحب دولھا والوں کے یہاں پہونچے اور انھیں والدہ صاحبہ کا پیغام پہونچایا۔ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ جب ہمارا ارادہ ہی ہو چکا کہ ہم دولھن کو نہیں لے جائیں گے تو ایسی صورت میں جانے اور بات چیت کرنے سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ گئے تھے دولھا صاحب سے باتیں کرنے اور وہاں اور لوگوں نے بیچ میں پڑ کر بات تک نہ کرنے دی۔ جو کچھ ممکن تھی کوشش کر کے چلے آئے۔

ان کا نظریہ بڑا ازوردار تھا۔ وہ یہ کہ میں اپنے گھر والوں کی اب کوئی نہیں ہوں جبکہ میرا عرصہ ہوا نکاح ہو چکا۔ انھوں نے وہاں جا کر اپنے نظریہ کو اس طرح سمجھایا" کہ ہماری لڑکی یا بھتیجی کے ساتھ

ظلم نہیں ہوا ہے بلکہ تم لوگوں کے یہاں ہی ایک عورت کے ساتھ ہوا ہے، انھوں نے ثابت کر دیا کہ ہم لوگوں کی اس میں کوئی بے عزّتی ہی نہیں ہے، اگر ہے کچھ تو تم لوگوں کی۔ اور ہم کچھ نہیں جانتے۔ لڑکی لے جاؤ اور تم جانو اور تمھارا کام۔"

ان تمام باتوں کو ان لوگوں نے تسلیم کیا بلکہ نان نفقہ کی ذمہ داری سے بھی مُنکر نہیں ہوئے مگر ساتھ ہی صاف انکار بھی کر دیا کہ لڑکی ہماری کام کی نہیں۔ پھر خود دولہا ہی کا صاف جواب تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے میں دولھن کو نہیں لے جا سکتا۔

اس کوشش کے ناکام ہونے کے بعد دو ایک اور عزیزوں نے متواتر اور پیہم حملے کئے مگر سب کے سب ناکام ہو کر لوٹے۔ رات کے خواب کی وجہ سے میں ہر کوشش کے بارے میں یہی سمجھتی تھی کہ یہ ضرور کامیاب ہو گی مگر آخر کو ناکامی ہی ہوتی تھی۔

---

دن کے کوئی دو بجے کا وقت تھا کہ آخری کوشش بھی ناکام ہوئی۔ اور تھک کر ہماری طرف والے قسمت پر صابر و شاکر ہو گئے۔ اب چار دن

طرف سے ناامید ہو کر سب رونے سے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ میرا بھی یہی حال تھا مگر اب سر سے پانی گذر چکا تھا، اور وہ مضمون تھا۔ ع

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتی ہوں رہزن کو

اب تکلیف ہی تکلیف تھی۔ جب روتے روتے تھک گئی تو یہ خیال آیا کہ یہ ہونا تھا اور اب ہو چکا مگر کیا بہتر ہوتا اگر میں کسی طرح خود شوہر سے مل کر اپنی معصومیت اور بے گناہی کا عذر کر سکتی۔ کہنے والوں نے بے شک کہا ہوگا مگر میری زبان سے کیسے کہہ سکتے تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ مجھے لے جائیں مگر یہ ناممکن ہے کہ میری بیگناہی پر یقین نہ کریں۔ میں بالکل بے قصور ہوں لہٰذا مجھے کہتے ہوئے کچھ شرم نہ آئیگی، یہ باتیں میں نے بار بار اپنے دل میں سوچیں۔ پھر یہ سوچی کہ اگر میں کہوں کہ ایک مصیبت زدہ ہوں، مجھے غیر جان کر میری مدد کرو۔ تو کیا ناممکن ہے کہ وہ راضی نہ ہو جائیں کہ اب نہ سہی دو چار روز بعد آکر مجھے لے جائیں۔ نہ سہی ایک نوکرانی کی طرح گھر میں پڑا رہنے دیں۔ نہ معلوم یہ باتیں اُن سے کسی نے کہی بھی ہیں یا نہیں کیونکہ علاوہ اس کے اور میرا ہو بھی کیا سکتا ہے۔

چنانچہ یہ اور اسی قسم کے خیالات میرے دل میں گذرے مگر سوال یہ تھا کہ کیا ترکیب کروں ۔ میں اماں جان کے پاس پہونچی ۔ وہ بیٹھی رو رہی تھیں ۔ میں نے ان سے صاف صاف اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ کسی طرح اگر میں مل لیتی تو کیا برا تھا ۔ انھوں نے میری باتیں سُنیں ۔ غور سے سُنیں ۔ کہنے لگیں کہ یہ سب بے سود ہیں ۔ مگر میں نے کہا کہ "میں بیاہتا بیوی ہوں اور کہوں گی کہ میں مصیبت میں پڑ گئی ، مجھے اب کسی طرح نکالو ۔ مجھے ساتھ مت لے جاؤ مگر مدد تو کرو ۔" یہ کہہ کر میں نے پختہ ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ "میری اس وقت جان پر بنی ہے اور سب لوگ کوشش کر چکے ہیں ، اب مجھے میری قسمت پر چھوڑ دو ۔" یہ کہہ کر جو میں چلی تو اماں جان ہڑبڑا کر جاگ سی اٹھیں اور کچھ آنکھیں پھاڑ کر بولیں "کیا تو جائے گی !!" میں نے کہا "نہیں ! میں بلاؤں گی ۔ اور نہ آئے تو سوچ لیا ہے میں نے کہ . . . ."

سر ہلا کر میں چلی آئی اور جلدی جلدی ایک خط لکھا ۔

آقائے من !

آپ کی کافی توہین اور بدنامی ہو چکی اور ابھی اور ہو گی ۔ آپ نے

نہ معلوم کیا کیا سُنا ہے۔ مگر حقیقت؟ کیا آپ کو معلوم ہے؟ ہرگز نہیں۔ پھر آخر مجھے الٹی چھُری سے ذبح کرنا چہ معنی دارد۔ اگر آپ میں خودداری ہے تو میں آپ کی بیاہتا بیوی ہوں، میرا بھی یہی فرض ہے، معاملہ کی حقیقت اور اصلیت ایک بیوی شاید سوائے میاں کے اور کسی کو نہیں بتا سکتی۔ پھر آپ تک حقیقت کیسے پہونچتی۔ جب ہی تو کسی نے کہا ہے کہ ع

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

کچھ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ محض سُنی سُنائی پر یقین کر گی گزرنا بہتر ہے یا اصلیت معلوم کر کے۔ لہٰذا اگر آپ کو سچائی اور اصلیت معلوم ہے تو مجھے میرا حق دیجیئے یعنی کم از کم دو منٹ کے لئے مجھ سے مل جائیے۔ اور اگر بے سوچے سمجھے محض سُنی سُنائی پر عمل کرنا ہے تو بسم اللہ۔ آپ سے نہیں، اپنی میری مقدر سے شکایت ہوگی۔ میں پھر عرض کرتی ہوں کہ آپ کی کافی بے عزتی ہو چکی اور ابھی اور ہوگی ورنہ دو منٹ کے لئے جانے سے پہلے مجھ سے مل کر حقیقت اور اصلیت تو معلوم کر جائیے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔ فقط۔ آپکی بدقسمت

آپ کہیں گے کہ یہ خط مُبالغہ آمیزی اور فریب کاری کا نمونہ ہے۔ اور معمّہ بنانے کی کوشش۔ تو جواب یہ ہے کہ ہوا کرے۔ مجھے تو کام سے مطلب۔ چنانچہ اس خط کو لفافہ میں بند کر کے امّاں جان سے کہا کہ آپ کسی معتبر ملازم کے ہاتھ بھجوا دیجئے۔ یہ کہہ کر کہ چپکے سے اکیلے میں دیدی خط پر پتہ کچھ نہ لکھا۔ خط دیتے دیتے میں نے کہا کہ زبانی یہ کہلوا دیجئے گا کہ اگر آپ نہ آئے تو وہ خود آئیں گی۔ اور یہ کہ والد صاحب یا چچا صاحب کو مطلع کرنیکی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

---

ایک بڈھا نائی تھا۔ اور امّاں جان کی نظر انتخاب اس پر پڑی۔ اسے بُلوا کر امّاں جان نے کہا کہ خلیفہ جی اگر کام بن گیا تو سونے کے کڑے تمہیں پہناؤں گی، اور یہ لالچ دے کر اُسے خط لے کر رخصت کیا۔ یہ نائی بڑا لسّان اور باتونی اور تجربہ کار تھا اور امّاں جان کو امید ہوئی کہ ضرور کسی نہ کسی طرح یہ بہلا پھسلا کر لے آئیگا، اُس کے جاتے ہی نئے سرے سے مجھے امید بندھ گئی کیونکہ دل گواہی دیتا تھا کہ ظالم سے ظالم شوہر بھی میری مصیبت میں ضرور میری مدد کریگا۔ کیا تعجب ہے کہ مشکل حل ہو جائے

گھنٹہ بھر بعد نائی بے نیل ومرام واپس آیا۔ اس نے خط تو جا کر دیدیا انھوں نے پڑھا بھی تنہائی میں مگر پھر اس خط کا ذکر کسی سے کر دیا، یا خود خط دکھا دیا کہ مخالفت کا طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ خوب بحث ہوئی اور جتنے بھی بزرگانِ خاندان تھے انھوں نے کہا کہ اس میں ضرور کوئی زبردست چال ہے بلکہ ایک صاحب نے تو تجویز کی کہ جلد سے جلد شہر چھوڑ دینا چاہیئے ورنہ دولھا کی جان کی خیر نہیں۔ قصہ مختصر منع کر دیا گیا اور سختی سے منع کر دیا۔ یہ مکمل جواب تھا۔ نائی نے یہ بھی بتایا کہ خط البتہ لیکر انھوں نے رکھ لیا ہے اور اپنے ایک دوست تھانیدار کو خط دکھا کر کچھ باتیں کرتا ہوا چھوڑ آیا تھا۔ نائی نے خود تنہائی میں باتیں کرنے کی جو کوشش کی تو لوگوں نے لتاڑ کر بھگا دیا۔ اب نائی یہ کہہ کر بولا کہ میں پھر جاتا ہوں۔۔ اور جو موقع مل گیا تو چوری چھپے سے اکیلے میں باتیں کر کے لگا لاؤنگا۔

یہ تھا نتیجہ خود میری آخری کوشش کا۔ میں دیوار کی اوٹ سے اس بڈھے نائی کی باتیں بڑے غور سے کھڑی خاموش سُن رہی تھی اور قطعی نہیں رو رہی تھی۔ مگر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں کی لڑیاں بیخبری میں بہتی چلی آ رہی تھیں۔ میں نے ایک آہِ سرد بھری اور چُپ چاپ

اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر بیدم ہو کر گر پڑی اور تکیہ میں منہ چھپا کر ایک خاموشی اور بیخبری کے عالم میں رونے لگی۔

نہ معلوم کتنی دیر تک میں اسی طرح روتی رہی حتیٰ کہ جاگتے ہی میں گذشتہ واقعات میرے سامنے سے ہو ہو کر گذر رہے تھے، خیالات کی گہرائی میں جاگتے میں جیسے ڈوب رہی تھی اور تمام واقعات ایک ایک کر کے بائیس کوپ کی طرح میرے سامنے سے ہو کر گذرتے معلوم ہو رہے تھے اس تمام استغراق کا نتیجہ کیا تھا؟ صرف یہ کہ اس خانہ خرابی کے بانی مبانی نے مجھے بے عزت کر کے کہیں کا نہ رکھا۔ او نامراد ظالم! خدا کا قہر تیرے اوپر پھٹ پڑے۔ تیرے گھر وبار پر آسمان لوٹ پڑے۔ تجھے مع تیری ظلم وستم کے زمین نگل جائے! قصہ مختصر اس بدکردار ناہنجار ظالم کی نفرت آمیز صورت میری آنکھوں کے سامنے تھی اور میں کٹکٹا کٹکٹا کر اور دانت پیس پیس کر کوس رہی تھی۔ رنج وغم نے ایک دم سے جوشش انتقام کی فراوانی پیدا کر دی تھی اور ساتھ ہی نفرت اور انتہائی نفرت کے جذبات سے مارے غصہ کے میں بے قابو ہو گئی۔

الغرض میں اس وقت اسی طرح غصہ اور تکلیف میں سانپ کی طرح

بل کھا رہی تھی کہ اماں جان بچوں کی طرح کمرے میں لپک کر آئیں اور ان کے منہ سے عجیب انداز میں نکلا "وہ آرہا ہے" اور یہ کہہ کر وہ جس تیزی سے آئی تھیں اس سے بھی جلدی ہاتھ کے جھٹکے دے کر واپس چلی گئیں۔

---

لمحہ بھر تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں کہ لپک کر میں نے اپنی دُلائی اوڑھ لی۔ جلدی سے دو چار ہاتھ مار کر مسہری کی چادر ٹھیک کی۔ پھر بڑی تیزی سے مسہری کے انتہائی کونے پر کچھ سکڑ کر بیٹھ گئی تاکہ آنیوالا عزیز مسہری کے دوسرے کونہ پر یعنی مجھ سے انتہائی فاصلہ پر بیٹھ سکے میں ہمہ تن انتظار تھی۔ دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور نہایت ہی تیزی سے خیالات دماغ کی تنگناؤں میں دوڑ رہے تھے یہ سوچ رہی تھی کہ بھلا کیا باتیں شروع ہوں گی۔ میں اسی پریشانی میں تھی کہ ایک دم سے میرا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ یعنی دروازہ پر کھٹکا سا ہوا۔ اور کھٹکے کے ساتھ قدرتاً میری گردن جھک گئی اور ہاتھ نے بغیر کسی ارادے کے بڑھ کر چادر سے چہرے کو چھپا لیا۔ پر وہ ہلنے کی سرسراہٹ

ہوئی اور مضبوط اور نئے جوتے کی چاپ کے ساتھ ایک مردانہ قدم کمرہ میں داخل ہوا...... میرا منہ چھپا ہوا تھا اور گردان جیسے کسی نے زبردستی پکڑ کر جھکا دی تھی۔ مگر پھر بھی میں نے ریشمی پتلون کی مُہری کا نیچے کا حصہ مع سیاہ جوتوں کے دیکھا..... میں اسی طرح ہٹی رہی اور وہ مسہری کے کونہ پر میری طرف دانستہ طور پر پُشت کر کے بیٹھ گئے۔

میں چُپ تھی۔ یہ سوچ رہی تھی کہ یا میرے اللہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ لیکن وہ بھی بالکل خاموش تھے۔ میں گھبرا رہی تھی اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں۔ اتنے میں آہستہ سے انھوں نے کھانس کر گلا صاف کیا۔ گویا خود بولیں گے۔ میں نے یہ دیکھکر کہ پُشت میری طرف ہے ذرا ہمت کر کے نظر اٹھائی اور چاہا کہ چپکے سے اپنے شوہر کے چہرے کی زیارت تو کر لوں مگر ممکن نہ ہوا......... کہ اتنے میں سامنے والے بڑے آئینہ پر نظر پڑی ...... بس نظر پڑنا تھی نہ ...... بجلی کی طرح میں تڑپی اور جھپٹ کر اس زور سے میں نے پیٹھ پر ان کے دو ہتڑ مارا ہے ..... "ارے ظالم!"....... ایک چیخ کے ساتھ میرے مُنہ سے نکلا اور میں اپنے بدمعاش اور ظالم

شوہر کے گلے سے لپٹ کر بیہوش ہو گئی!! وہ جس نے کہ میری مٹی خراب کی تھی! اور وہی عزیز تر ین ظالم جسے میں ابھی ابھی کٹ کٹ کر کوس رہی تھی!!

# درد کا حد سے گذرنا ہی دوا ہو جانا

مجھے ہوش آیا ہے تو میں نے آنکھیں جھپکا کر غور سے دیکھا کہ کہیں خواب تو نہیں ہے! مجھے وہی شخص نہایت ہی محبّت سے سنبھالے ہوئے تھا جس نے میری زندگی اُجیرن کر رکھی تھی! .........

مگر اب!

غور سے سر جھکائے محبّت آمیز مُسکراہٹ سے اپنے ہاتھوں سے میرا سر سنبھالے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں بیدم تھی۔ مگر میں نے اس خیال سے کہ کہیں یہ خوابی شکل تو نہیں اپنے ہاتھ سے آہستہ سے پیشانی کو چھو کر دیکھا۔

مُسکرا کر میرے دغاباز شوہر نے کہا "دیکھتی کیا ہو؟ وہی چوٹ کا

نشان ہے . . . . جب تم نے زور سے تپائی گھما کر ماری تھی۔"

خوشی کے درد سے میں نے بیتاب ہو کر کہا "تم نے مجھے بہت پریشان کیا۔" اور اتنا کہہ کر میری آنکھوں سے آنسو نکلنا شروع ہو گئے "میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔" یہ کہہ کر میں نے کچھ پریشان ہو کر دونوں ہاتھوں سے اُن کی مضبوط کلائی پکڑ لی اور پھر زور دیکر روتے ہوئے کہا "ہرگز نہیں چھوڑونگی۔"

"ارے ارے!" انھوں نے گھبرا کر کہا "خدا کے واسطے" . . . . . یہ کہہ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

"تم نے مجھے بہت پریشان کیا۔" میں نے پھر اُسی طرح کہا۔

"یہ دیکھو۔" انھوں نے اپنی انگلی دکھا کر کہا جس میں میں نے کاٹ کھایا تھا "یہ دیکھو" انھوں نے زور دیکر مسکراتے ہوئے کہا "تین مہینے تک پکا کی۔ کٹکھنی ہو تم۔" یہ کہہ کر مجھے بٹھا دیا۔

میں اُٹھ بیٹھی اور میں نے مضبوطی سے کوٹ کا دامن پکڑ لیا۔ اور آنسو پونچھ کر شاید۔ بے حد بے ہمی کے الفاظ دلی خوشی سے کہے! "مجھے ابھی لے چلو . . . . تم نے میری مٹی خراب کی . . . . . . تم اول نمبر کے

بدچلن اور آوارہ ہو...... خوب خوب میں نے تمھیں کوسا ہے...
....بڑے آوارہ اور بدچلن ہو تم.... سخت بدچلن"
"مت بکواس کرو" مذاق میں انھوں نے ڈانٹ کر کہا۔ کیا بدچلنی کی میں نے ؟ آخر کون سی بدچلنی یا آوارگی تم نے میری سُنی ؟ تم سے کسی نے بالکل جھوٹ کہہ دیا۔ غلط... بالکل غلط...... بتاؤ...... بتاؤ...... آخر بولتی کیوں نہیں ہو؟"

میں بیچاری کیا بولتی۔ مارے خوشی کے میرا دل کھنچا جا رہا تھا۔ اور مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ اماں جان سے تو کہہ دوں۔ یہ خیال کرتے ہی میں اچھل سی پڑی۔

"کہاں ؟" انھوں نے کہا۔

میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔" اماں جان...."

" ارے ٹھیرو تو" وہ بولے" کیا کہو گی آخر؟"

"کیوں ؟" میں نے کہا "کیا کہوں گی ؟ یہی کہوں گی جو بات ہے ... لو اور سُنو۔ ذرا ٹھیر تو جاؤ...... تم نے میرے باپ دادا کی عزّت دو کوڑی کی کر رکھی ہے ذرا تمھارے مُنہ پر کالک نہ لگے جو ہماری

مصیبت جائے!" یہ کہہ کر میں اماں جان کے پاس پہونچی، وہ میرے لئے نفل پڑھ کر دعاؤں میں مشغول تھیں۔ میں کھنبے کے پاس جو تیزی سی مارے خوشی کے گھبرائی ہوئی پہونچی ہوں تو میں نے انھیں دعا کے لیئے ہاتھ پھیلائے رو رو کر کوستے ہوئے سُنا۔

"... الٰہی جس نے میری عزّت بگاڑی اس پر خدا کا قہر ہی ٹوٹے ....." میں نے اس منحوس دعا پر جل کر تیزی سے لپک کر اُن کی بد دعا کے لئے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ مار کر کہا۔" یا میری اللہ ..... مت کوسو!"

"ہیں!" انھوں نے میری طرف آنسوؤں سے تر آنکھوں سی دیکھا" کسے کوس رہی ہو؟" میں نے مارے خوشی کے اُن پر گرتی ہوئے کہا۔" وہی تو ہیں ...... وہی تو نکلے!"

بس اتنا اماں جان کا سُننا تھا کہ پاگلوں کی طرح مارے خوشی کے ان کے منہ سے چیخ نکلی اور لپکیں وہ جوتے چھوڑ کر والد صاحب کی طرف۔ میں بھی تیزی سے پہونچی ہوں تو وہ کہہ چکی تھیں۔ اور وہ مارے خوشی کے "ارے" کی ایک چیخ مار کر بیہوش ہو چکے تھے۔ میں

نے جھانک کر دیکھا اور چپکے سے واپس آئی۔

"کہو کیا حال ہے؟ کہہ دیا آخر تم نے" انھوں نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

مجھے ان کی صورت دیکھکر مارے خوشی کے پھر رونا آگیا اور میں روتی ہوئی دوسرے ہاتھ سے اپنا منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ مجھے گلے سے لگایا۔ نہایت ہی محبّت سے مجھے دلاسا دیا اور پھر مجھے سیدھا کر کے کہا :۔

"اب میں جاتا ہوں سب سے چھپ کر آیا تھا"

"میں ہرگز نہ جانے دوں گی" میں نے کہا "تم پھر مجھے چھوڑ کر چل دوگے" یہ کہتے ہوئے میں نے گویا محسوس کیا کہ اب یہ بھاگے اُٹھ کر یہاں سے! اور اب میں جھپٹی انھیں پکڑنے کو کہ کہیں مجھی بالکل ہی چھوڑ کر نہ چل دیں۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی پھر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنا شروع ہو گئیں۔

مگر میرے "بدمعاش" شوہر نے مجھے ہنستے ہوئے پھر گلے سے لگا لیا۔ چمکارا۔ دلاسا دیا۔ محبّت آمیز معافی مانگی اور محبّت کا سلام

کر کے رخصت ہوئے کہ ابھی ابھی سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا "خدا حافظ"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ چلے گئے اور میری آنکھوں سے خوشی کے آنسوؤں کا دھارا

بہہ رہا تھا۔ فقط

ایک خوش قسمت

# تمام شد

# واقعاتِ دارالحکومت دہلی

دلی ایسا قدیم شہر ہے کہ اس کے جوڑ کا کوئی شہر رُوئے زمین پر نہیں ہے۔ جس کے کھنڈر ۴۵ مُربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اِس شہر کے کئی نام بدلے کئی بار بسا اور اُجڑا، گرا اور پہلے سے زیادہ بارونق ہو کر اُبھرا، ہر بگاڑ میں ایک بناؤ تھا۔ یہی وہ مقدس شہر ہے جو پہلے پہل نامور راجگانِ ہنود مثل راجہ یدھشٹر اور رائے پتھورا، کا راج دھانی رہا۔ یہیں بڑی بڑی مذہبی رسوم اشومیدھ یگ اور سوئمبر کی ہوئیں، جشن ایسے ہوئے کہ اندر کا اکھاڑہ بن گیا۔ دُوسرا دور مُسلمان بادشاہوں کا تھا جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ "بادشاہانِ ہند بادشاہی نمی کنند بلکہ خدائی می کنند"۔ یہی وہ سرزمین ہے جسنے بڑے بڑے معرکے دیکھے ہیں۔ یہی وہ خطہ ہے جس کی زمین کی آبیاری خونِ انسانی سے ہوئی ہے۔ اِس کا چپہ چپہ نامور ہڈیوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ سلاطینِ اسلام کی متعدد مستقل یادگاریں اَب بھی باوجود امتدادِ زمانہ اُن کی شان و شوکت اور عظمت و جبروت اور سطوت اور شکوہ کا بین ثبوت ہیں جو آج بھی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ یہ عمارتیں اپنے بانیوں کی طاقت اور لاثانی سلطنت کا سکہ بٹھا چکی ہیں، جن کے دیکھنے کو اَب بھی لوگ شوق کے سلسلے میں جکڑے ہوئے جوق جوق چار دانگ عالم سے کشاں کشاں رواں دواں چلے آتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں اگرچہ یورپ کی عمارتیں دیکھ چکی ہیں مگر ان کو جب دیکھتے ہیں تو پھڑک اُٹھتے ہیں اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ ۱۵۰۰ برس قبل مسیح سے دِلّی کا پتہ چلتا ہے، دِلّی نے کئی جگہیں بدلیں اور کئی نام، کبھی اندر پرست کہلائی کبھی دِلّی اور کبھی شاہجہان آباد۔ مُسلمانوں کی سلطنت منتزع ہونے کے بعد دِلّی گویا مٹ گئی۔ دارالسلطنت کے مرتبے سے گھٹتے گھٹتے صرف ضلع رہ گیا، پھر خدا نے صدہا سال کے بعد اِسکے دن پھیرے اور عہدِ انگریزی میں بھی دارالسلطنت قرار پائی، دِلّی ہند کی تمام حکومتوں اور سلطنتوں کی جنم بھوم ہے۔ اسی سرزمین سے بادشاہ بے

وہ پھول کی مانند نرم و نازک تھی، لیکن اس کے سینہ میں پتھر سے بھی زیادہ سخت دل تھا۔

وہ مجسّم محبّت تھا۔ لیکن ہر قسم کی قربانیوں کے عوض اسے کیا ملا۔ صرف فریب ۔۔۔؟

وُہ حُسن و جمال کا مجسمہ تھی۔ لیکن اُس کے عشقِ جہاں سوز کی گرمی بھی اِس پتھر کے پھُول کو نہ پگھلا سکی جس سے وہ محبّت کرتی تھی۔

محبت کی ایک دلفریب کہانی!

# پتھر کے پھُول

اظہار اثرؔ کا رومان انگیز ناول۔ جس میں آپ کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی آپ اظہار اثر سے توقع رکھتے ہیں ۔۔۔۔۔

محبت ۔۔۔ جوانی ۔۔۔ حُسن ۔۔۔ رنگ و نکہت ۔۔۔ ان تمام چیزوں کے خمیر سے یہ پتھر کے پھول بنائے گئے ہیں، جو آپ کے تصورات پر بہار بن کر چھا جائیں گے۔

صفحات ۲۵۰ ۔۔۔۔ قیمت تینؔ روپے۔

چلے آئے ہیں۔ دِلی کی تاریخ گویا سارے ہندوستان کی تاریخ ہی، کیونکہ اِسی ٹکسال میں بادشاہ ڈھلتے تھے، یہ خطہ بادشاہ گر ہے۔ مسٹر ہیلی چیف کمشنر دہلی نے مولوی بشیر الدین احمد صاحب خلف الرشید شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم سے خواہش کی کہ مبسوط مفصل تاریخ سرزمین دہلی کی لکھیں۔ اگرچہ سر سید کی بے نظیر کتاب آثار الصنادید اپنی جگہ لاجواب ہے، مگر قریب قریب سَو برس پہلے کے حالات زمانہ حال کی تحقیق و دریافت اور محکمہ آثارِ قدیمہ کی توجہ گراں مایہ کے سبب سے ناکافی ہیں، لہٰذا مولوی صاحب نے اس بارِ گراں کو اپنے سر لیا، تمام مقامات کو جا جا کر دیکھا ان کے نقشے بنوائے اور سنہ ۱۹۲۰ء تک کی مکمل تاریخ نہایت محنت اور کاوش اور تحقیق سے لکھی۔ علاوہ اُردو کی انگریزی کی تمام مستند کتابوں سے بھی مدد لی جتنا بڑا شہر دلّی ہے اتنی ہی بڑی کتاب بھی ہی۔ اور کیسے نہ بڑھتی، دریا کو کوزہ میں بند کرنا محال ہی نقشوں کا بنوانا، فوٹو تیار کرانا اور پھر اتنی بڑی ضخیم کتاب کا چھپوانا مُنہ کا نوالہ نہ تھا۔ ڈھائی برس کی لگاتار محنت، صرف کثیر، بھاگ دوڑ اہلِ مطبع اور کاتبوں کی ناز برداری کے بعد خدا خدا کر کے کتاب مکمل ہوئی قیمت بیشک اس کتاب کی زیادہ ہے کیونکہ لاگت زیادہ بیٹھی ہے۔ لوکل گورنمنٹ نے اس تاریخ پر ہزار روپے کا اعزازی انعام مرحمت فرمایا ہی، اور گورنمنٹ پنجاب، یو۔پی وغیرہ نے اسے کتب خانوں کیلئے منظور کیا ہی۔

شہرِ دہلی کی یہ لاجواب تاریخ تین جلدوں میں ہی۔ ۲۵۶۶ صفحات، تقطیع ۲۲×۲۹ عُمدہ سفید کاغذ ۲۰۹ نقشہ جات تصاویر قلمی، ۹ عکسی تصاویر۔ قیمت ہر سہ حصص بلا جلد پچیس ۲۵ روپے محصول ڈاک علاوہ۔ مجلد ہاف چرمی ہر جلد علیحدہ علیحدہ مجلد شدہ تیس ۳۰ روپے۔ خریداروں کو تینوں جلدوں کا پورا سٹ دیا جائے گا جدا جدا جلدیں نہ ملیں گی۔

حِصّۂ اوّل :- ۵۵۰ قبل مسیح سے ۱۹۲۰ء تک کی مکمل تاریخ ۱۰۶۶ صفحے، ۵۶ نقشہ جات و تصاویر قلمی، ۷ فوٹو۔

حِصّۂ دوم :- اندرون و ملحقات شہر کی عمارات ۹۵۲ صفحے، ۸۲ نقشہ جات و تصاویر قلمی۔

حِصّۂ سوم :- بیرونِ شہر و مضافاتِ شہر کی عمارتیں، ۵۴۵ صفحے، ۷۱ نقشہ جات و تصاویر قلمی، دو فرمانوں کے فوٹو — کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب صحت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔